یکم فروری ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۳

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمد الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱_۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

غزہ کی تعمیرِ نو ایک مشکل مرحلہ!

غزہ کی پٹی اسرائیل کے فوجی حملے کی وجہ سے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہے۔ فلسطینی علاقے کی دوبارہ تعمیر کا عمل تاریخ کی سب سے مشکل تعمیرِ نو کی کوششوں میں سے ایک ہوگا۔

اکتوبر ۲۰۲۳ء سے، اسرائیل کے بلا توقف فضائی حملوں اور بمباریوں نے غزہ کے بنیادی ڈھانچے کو تباہ کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں غزہ کے ۲۳ لاکھ باشندے شدید تکالیف اور تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔

اسرائیلی افواج نے ایک لاکھ ۵۷ ہزار سے زائد فلسطینیوں کو شہید یا زخمی کیا، جن میں بیشتر خواتین اور بچے شامل ہیں اور ہزاروں گھروں، اسکولوں اور اسپتالوں کو ملبے میں تبدیل کر دیا۔ اسرائیل کے خلاف بین الاقوامی عدالتِ انصاف میں نسل کشی کا مقدمہ درج کیا گیا ہے، جبکہ بین الاقوامی فوجداری عدالت نے اس کے وزیرِ اعظم بن یامین نیتن یاہو اور سابق وزیرِ دفاع یوآو گالانٹ کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کیے ہیں۔

اب اسرائیل اور حماس کے درمیان حالیہ طور پر طے پانے والے جنگ بندی کے معاہدے کے بعد، عالمی توجہ غزہ کی دوبارہ تعمیر کے مشکل چیلنج کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔

معاہدے کے تیسرے مرحلے میں غزہ کی دوبارہ تعمیر کو کئی ممالک اور تنظیموں کی نگرانی میں شامل کرنے کی تجویز دی گئی ہے، ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ آگے کا راستہ پیچیدہ رکاوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ ملبہ ہٹانے کے لاجسٹک مسائل سے لے کر تعمیرِ نو کے بھاری مالی بوجھ تک۔

صرف ۳۶۰ مربع کلومیٹر (۱۳۹ مربع میل) پر محیط غزہ کی پٹی نے ایسی تباہی برداشت کی ہے جو دنیا کے سب سے زیادہ تباہ کن جنگی واقعات کی یاد دلاتی ہے، جیسے دوسری جنگ عظیم میں ڈریسڈن پر بمباری یا ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملے۔

رپورٹ کے مطابق غزہ کی پٹی میں ان ۶۶ فیصد متاثرہ عمارتوں کی کُل تعداد ۱۶۳,۷۷۸ ہے۔ اس میں ۵۲ ہزار ۵۶۴ عمارتیں مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہیں، ۱۸ ہزار ۹۱۳ کو شدید نقصان پہنچا ہے، ۳۵ ہزار ۵۹۱ عمارتوں کو درمیانے درجے پر نقصان پہنچا ہے، اور ۵۶ ہزار ۷۱۰ عمارتیں جزوی طور پر متاثر ہوئی ہیں۔

یو این او ایس اے ٹی (UNOSAT) کے ستمبر کے جائزے کے مطابق غزہ کا گورنریٹ سب سے زیادہ متاثرہ علاقے کے طور پر سامنے آیا، جہاں ۴۶ ہزار ۳۷۰ عمارتوں کو نقصان پہنچا، جبکہ غزہ شہر میں ۳۶ ہزار ۶۱۱ عمارتیں متاثر ہوئیں، جن میں سے ۸ ہزار ۵۷۸ عمارتیں مکمل طور پر تباہ ہوگئیں۔

اقوام متحدہ کی ایک پچھلی رپورٹ اپریل ۲۰۲۴ء میں یہ تخمینہ لگایا گیا تھا کہ اسرائیلی بمباری کے نتیجے میں تقریباً ۳ لاکھ ۷۰ ہزار رہائشی یونٹس کو نقصان پہنچا، جن میں سے ۷۹ ہزار مکمل طور پر تباہ ہوگئے۔ اقوام متحدہ کے خصوصی رپورٹر برائے رہائش، بلیک کرشن راج گوپال نے کہا ہے کہ غزہ کے رہائشی علاقے کا ۶۰۔۷۰ فیصد حصہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ شمالی غزہ میں یہ شرح ۸۲ فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔

ناروے کے پناہ گزینوں کے کونسل (NRC) کی قیادت میں پناہ گزینی کلسٹر کی رپورٹ کے مطابق، غزہ میں ہر دس میں سے نو گھروں کو نقصان پہنچا ہے یا وہ مکمل طور پر تباہ ہو چکے ہیں، ساتھ ہی اہم بنیادی ڈھانچوں جیسے اسپتال، اسکول اور پانی کی سہولتیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔

UNOSAT نے اقوام متحدہ کی فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن (FAO) کے تعاون سے یہ بھی دریافت کیا کہ غزہ کی پٹی کے تقریباً ۶۸ فیصد کھیتوں کو نقصان پہنچا ہے۔

اقوام متحدہ کی تجارتی اور ترقی کی کانفرنس (UNCTAD) کی ابتدائی ۲۰۲۴ء کی جائزے میں یہ بات سامنے آئی کہ غزہ کے زرعی وسائل کا ۸۰ فیصد سے ۹۶ فیصد تک تباہ ہو چکا ہے، جن میں آبپاشی کا نظام، مویشیوں کے فارم، باغات، مشینری اور ذخیرہ کرنے کی سہولتیں شامل ہیں۔

غزہ کی دوبارہ تعمیر کا مالی بوجھ بھی غیر معمولی ہے۔ ستمبر میں اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) کے عرب ریاستوں کے علاقائی دفتر نے تعمیرِ نو کی مجموعی لاگت کا تخمینہ ۴۰ ارب ڈالر سے زائد لگایا۔

ابتدائی بحالی کا مرحلہ، جو بنیادی خدمات اور بنیادی ڈھانچے کی بحالی پر مرکوز ہے کا تخمینہ ۲ ارب سے ۳ ارب ڈالر کے درمیان ہے، اور اس میں تین سے پانچ سال لگنے کی توقع ہے۔ دوسری جانب UNCTAD نے جنوری ۲۰۲۴ء

اندرونی صفحات پر

- گرین لینڈ: عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا نیا میدان
- ٹرمپ کے مبہم بیانات، غزہ معاہدے کا مستقبل؟
- فلسطینیوں کو غزہ سے نکالنے کی تیاری؟
- امریکی استعمار کو زندہ کرنے کی کوشش
- فلسطینی پسپا ہوں گے، نہ دست بردار
- بنگلا دیش: شیخ حسینہ کے ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ
- تہذیبوں کی تشکیل و تعمیر اور اسلامی تہذیب۔۔۔
- گھنٹے بچانے سے بہتر ہے، سیکنڈ بچائیں

کے آخر تک غزہ کے بنیادی ڈھانچے کو پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ ۱۸٫۵ ارب ڈالر لگایا ہے، جو ۲۰۲۲ء میں غزہ کی مجموعی ملکی پیداوار (GDP) سے سات گنا زیادہ ہے۔ غزہ کی دوبارہ تعمیر، مختلف تجزیوں کے مطابق، نسلوں کا وقت لے سکتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ماہر راجا گاپال نے تخمینہ لگایا ہے کہ موجودہ حالات میں، جاری قبضے اور ناکہ بندی کی وجہ سے تعمیرِ نو میں ۸۰ سال تک کا وقت لگ سکتا ہے۔

اگر اسرائیل غزہ میں تعمیراتی سامان کی درآمد میں پانچ گنا اضافہ کرنے کی اجازت دیتا ہے تو بھی اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے مطابق، صرف رہائشی تعمیرِ نو ۲۰۴۰ء تک مکمل ہونے کا امکان ہے۔ اس تخمینہ میں اسپتالوں، اسکولوں، بجلی کے پلانٹس اور پانی کے نظام کی دوبارہ تعمیر شامل نہیں۔

ماہرین کا اتفاق ہے کہ غزہ کی تعمیرِ نو اسرائیلی ناکہ بندی کی وجہ سے شدید متاثر ہوگی، جو ضروری تعمیراتی سامان کی آمد کو محدود کرتی ہے۔ فلسطین میں این آر سی کی مشیر مواصلات شائنہ لونے تعمیراتی سامان جیسے لکڑی، سیمنٹ اور اوزاروں پر پابندیوں کو ہٹانے کی فوری ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے انادولو کو بتایا کہ ہمیں اسکریننگ کے عمل میں رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا اور یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ سامان کو بلا کسی شرط کے داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ واپس آنے والے مکینوں کی حفاظت ایک اور سنگین مسئلہ ہے۔

اقوام متحدہ کی مائن ایکشن سروس (UNMAS) کا اندازہ ہے کہ غزہ میں ۷۵۰۰ ٹن غیر استعمال شدہ بارود بکھرا ہوا ہے، جس کی صفائی میں تقریباً ۱۴ سال لگ سکتے ہیں۔

شائنہ لو نے غیر استعمال شدہ بارود اور کمزور عمارتوں کے خطرات کو مدنظر رکھتے ہوئے حفاظتی جائزوں کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ضروری ہے کہ ''عمارتوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے فوراً جائزے کیے جائیں، اور ان افراد کو جو اپنے گھروں کی طرف واپس آ رہے ہیں، ممکنہ خطرات کے بارے میں آگاہ کیا جائے''۔

غزہ میں ملبے کے حجم کے بارے میں اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام (UNEP) کی اگست میں کی جانے والی ایک تحقیق کے مطابق، وہاں ۴۲ ملین ٹن ملبہ موجود ہے جو گزشتہ ۱۶ برسوں میں تمام علاقائی تنازعات کے ملبے کے حجم سے ۱۴ گنا زیادہ ہے۔

اقوام متحدہ کے دیگر عہدیداروں نے کہا ہے کہ غزہ میں تقریباً ۳۷ ملین ٹن ٹھوس فضلے کو صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''اس عمل کے لیے زبردست کوششوں کی ضرورت ہوگی اور شاید اس کو مکمل کرنے میں کئی سال لگیں گے۔ ملبہ ہٹانے میں فوری مدد کے لیے سامان اور ایندھن کی اجازت دی جانی چاہیے''۔

رہائش، زمین اور جائیداد کے حقوق

غزہ کی دوبارہ تعمیر میں ایک اور بڑا مسئلہ اس کے مکینوں کی رہائش اور زمین کے حقوق ہوں گے۔ مثال کے طور پر ملٹی اسٹوری اپارٹمنٹ عمارتوں میں جہاں متعدد خاندان رہتے تھے، سوال یہ ہوگا کہ جب عمودی جگہ موجود نہ ہو تو واپس آنے والے خاندانوں کے لیے مناسب جگہ کیسے فراہم کی جائے اور زمین کو کس طرح منصفانہ طور پر تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ جب فلسطینیوں کو غزہ میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت ملے گی تو آبادی کی تقسیم میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں آئیں گی۔ جو عارضی مراکز اس وقت موجود ہیں، وہ شاید خالی ہو جائیں گے اور لوگ اپنے گھروں میں واپس آئیں گے۔ اس سے یہ مسائل پیدا ہوں گے کہ یہ شناخت کرنا مشکل ہو جائے گا کہ کس کو کیا ضرورت ہے۔

شیا نے متنبہ کیا کہ دوبارہ آبادکاری لبنان کی جنگ کے بعد کی تعمیرِ نو کی طرح ہو سکتی ہے، جہاں کمپنیاں ''چھوٹے پلاٹس پر تعمیر نہیں کر پاتی تھیں جو تاریخی طور پر کئی نسلوں سے وراثت میں ملے تھے''۔ اس رکاوٹ کو حل کرنے کے لیے، چھوٹے پلاٹس کو بڑے گروپوں میں اکٹھا کر دیا گیا اور مالکان کو حصے دیے گئے، لیکن وہ حصے زمین کی تباہ شدہ قیمت کی بنیاد پر تھے، جس سے لبنان میں سب سے بڑا سوشل اکنامک تنازع پیدا ہوا۔

غزہ اور فلسطین کا مستقبل

غزہ کی تعمیرِ نو کی قیادت کون کرے گا، اس بارے میں سوالات باقی ہیں۔ ''کیا یہ قطری ہوں گے، سعودی ہوں گے، یا امریکی؟ شیا نے کہا اور یہ بھی بتایا کہ بین الاقوامی فنڈنگ اور داخلی سیاست بھی ایسے مسائل ہیں جنہیں حل کرنا ضروری ہوگا۔

این آر سی کی لو نے اس بات پر زور دیا کہ دوبارہ آبادکاری کا عمل غزہ کے ان فلسطینیوں کی قیادت میں ہونا چاہیے جو ۱۵ ماہ کی کشیدگی میں براہ راست متاثر ہوئے۔

دوبارہ آبادکاری کے عمل میں یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ انسانی حقوق اور انسانی قوانین کا احترام اور پیروی کی جائے۔

شیا نے غیر منظم ترقی کے بارے میں تشویش ظاہر کرتے ہوئے خبردار کیا کہ اگر دوبارہ آبادکاری کو آزاد منڈی کے عمل کے طور پر اختیار کیا گیا، تو غزہ اپنی شناخت کھو سکتا ہے اور جدید شہروں میں بدل سکتا ہے جو اس کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کو مٹا دیں گی۔

انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ وہ نقطہ نظر ہے جسے کئی لوگ، خاص طور پر اسرائیلی، اپنے آبادکاری کے استعماری وژن کو فروغ دینے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ فلسطینیوں کے لیے ایک سیاسی منصوبہ ہو سکتا ہے تاکہ وہ غزہ کو اس طرح دوبارہ تعمیر کریں جو ان کے تصور کردہ نئے فلسطین کی عکاسی کرے۔

اگر غزہ کو صرف ایک اور تعمیراتی مقام سمجھا جائے گا تو زمین کی ملکیت اور تاریخی تعلق جیسے گہرے مسائل نظر انداز کر دیے جائیں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جو کچھ تباہ ہوا وہ صرف پتھر نہیں تھا۔۔۔ بلکہ ایک پورا سماجی اور شہری ڈھانچا، ایک پورا منظر نامہ تھا۔ (مترجم: محمود الحق صدیقی)

"Rebuilding Gaza: Enormous costs and complex challenges ahead".
("Middle East Monitor". January 17, 2025)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی مطبوعات... رمضان المبارک میں مطالعے کے لیے مفید!

رَوزے کا اَصل مَقصد	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	-/10
رَوزہ اور ضَبطِ نَفس	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	-/10
رَوزہ اور ہماری صِحّت	ڈاکٹر خالد مشتاق۔ مولانا ساجد جمیل	-/40
خُلاصہ مَضامینِ قُرآن (مولانا مودودیؒ کی تحریروں سے مرتب کردہ)	مرتب: تنویر آفاقی	-/500
تَجَلّیاتِ قُرآن	مولانا سید جلال الدین عمری	-/450
اِنقلابی کِتاب	سید طاہر رسول قادری	-/250
سِیرتِ سَیِّدُ الاَبرار	منیر احمد خلیلی	-/1200

اور دیگر بیسیوں کتابیں اور کتابچے، قاری کے لیے مفید اور کتب خانے کی زینت!

اکیڈمی بک سینٹر۔ ڈی ۳۵، بلاک ۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: ۳۶۳۶۸۰۲۰

گرین لینڈ عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا نیا میدان

افتخار گیلانی

ڈنمارک کا دارالحکومت کوپن ہیگن سے پورے ساڑھے ۶ گھنٹے کی اعصاب شکن فلائٹ کے بعد ایئر گرین لینڈ کے ہلکے طیارہ کے پائلٹ نے جب اعلان کیا کہ کچھ لمحوں کے بعد طیارہ گرین لینڈ کے دارالحکومت نوک میں لینڈ کرنے والا ہے اور باہر کا درجہ حرارت منفی سترہ ڈگری سیلسس ہے، تو لگا جیسے ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی ہے۔

یہی حال پاس کی سیٹوں پر براجمان تین رکنی بھارتی صحافیوں کے گروپ کا بھی تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر امید کر رہے تھے کہ کشمیر کی برفانی وادیوں میں بچپن گزارنے کی وجہ سے سردی میرا کچھ زیادہ بگاڑ نہیں سکے گی۔

شاید کم افراد کو ہی علم ہوگا کہ سائبیریا کے بعد دنیا کا سرد ترین رہائشی علاقہ دراس، سابق جموں وکشمیر کی ریاست میں ہی ہے، جہاں ۱۹۹۵ء میں درجہ حرارت منفی ۶۰ ڈگری سیلسس ریکارڈ کیا گیا تھا۔ سونہ مرگ سے زوجیلا درہ کراس کرتے ہی لداخ کے خطہ کے مٹائین کی بستی کے بعد دراس کا قصبہ آتا ہے۔ کارگل جنگ کے دوران میڈیا کے نمائندے اکثر یہیں قیام کرتے تھے، کیونکہ اس سے آگے رسائی نہیں ہوتی تھی۔

سال ۲۰۱۲ء میں بھارت، ڈنمارک سے کچھ ایسے ہی ناراض تھا، جیسے وہ آجکل پاکستان سے ہے۔ جس طرح فی الوقت پاکستانیوں کے ویزا پر قدغنیں ہیں، کرکٹ میچ حتیٰ کہ غیر ملکی مہمانوں کو بھی بھارت سے براہ راست پاکستان سفر کرنے سے روکنا وغیرہ، کچھ ایسی ہی سفارتی صورتحال ڈنمارک کے ساتھ بھی تھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۹۵ء میں مغربی بنگال کے پورولیا ضلع میں طیارہ سے ہتھیاروں کی ایک کھیپ گرانے میں ڈنمارک کا ایک شہری کیم ڈیوی ملوث تھا، جو بھارتی ایجنسیوں کو جل دینے میں کامیاب ہوکر بھاگ گیا تھا۔ اس کی حوالگی کے حوالے سے بھارت نے کافی کاوشیں کیں اور ۲۰۱۱ء میں جب اس کی پوری تیاریاں کرلی گئی تھیں، کہ ڈنمارک کی عدالت نے اس پر روک لگادی۔

ڈنمارک حکومت نے اس فیصلے کو چیلنج کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا تھا، جس سے بھارت سخت ناراض تھا۔ ڈنمارک سے سبھی اعلیٰ سطحی دورے منسوخ کیے گئے تھے۔ ڈنمارک کی اس وقت کی وزیراعظم یا وزیر خارجہ، جو گجرات سرمایہ کاری سمٹ میں شرکت کرنا چاہتی تھیں، کو آنے سے منع کر دیا گیا۔ ڈینش براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے نمائندوں کی صحافتی ایکریڈیٹیشن منسوخ کر دی گئی، اور اس جیسے متعدد اقدامات اٹھائے گئے۔ ڈینش تاجروں کے ویزا، ہولڈ پر ڈالے گئے تھے۔ ڈنمارک کا کہنا تھا کہ وہ بھارت کو خوش کرنے کے لیے اپنے عدالتی سسٹم کو منہدم نہیں کر سکتے۔

جیسے ابھی حال ہی میں پاکستان کی حکمران مسلم لیگ کے صدر نواز شریف نے بھارتی صحافی برکھادت اور چند دیگر صحافیوں کو انٹرویو دے کر بھارتی عوام کے ساتھ براہ راست روبرو ہونے کی کوشش کی، اسی طرح ان دنوں ڈنمارک کی حکومت نے بھی چند بھارتی صحافیوں کو کوپن ہیگن کا دورہ کروا کے اور پھر گرین لینڈ لے جا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ڈنمارک کے ساتھ سفارتی کشیدگی سے خود بھارت کا ہی بڑا نقصان ہو رہا ہے۔

طلسماتی دلکش شہر نوک میں قدم رکھتے ہی احساس ہوگیا کہ جیسے کسی شہر خموشاں میں آگئے ہیں۔ ماہ نومبر میں دن ہی بس چار گھنٹے کا ہوتا ہے۔ آرکٹک کے سمندر میں ایک اسکیمو مچھوارے جوڑے کے ایک کشتی کو کھینچنے کی آوازیں اس خاموشی میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔

دنیا کے سب سے بڑے جزیرے، جس کا رقبہ ۲۱ لاکھ مربع کلومیٹر ہے، میں آبادی ۶۰ ہزار سے بھی کم ہے۔ بھارت کے اتر پردیش صوبہ میں دو لاکھ مربع کلومیٹر کے رقبہ میں ۲۲ کروڑ اور پاکستان کے ۸ لاکھ مربع کلومیٹر میں ۲۴ کروڑ نفوس آباد ہیں۔ پورے نوک شہر کی ۲۰ ہزار کی آبادی ہمارے علاقوں کے محلّہ کی آبادی سے بھی کم ہے۔ شہر میں چند سڑکیں ہیں، پھر پورے جزیرے میں کوئی سڑک نہیں ہے۔ نقل وحمل کے ذرائع اسٹیمر، چھوٹے ہوائی جہاز، اسنو اسکوٹرز یا برف گاڑیاں یا سلیج جن کو کتے کھینچتے ہیں۔

ڈنمارک سے کوسوں دور ہونے کے باوجود ۱۹۳۳ء میں کورٹ آف انٹرنیشنل جسٹس نے کینیڈا کے دعوے کو خارج کر کے اس کو ڈنمارک کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ آرکٹک جزیرہ ۱۸ویں صدی ہی ڈینش کالونی تھا، مگر کینیڈا کا بھی اس پر دعویٰ تھا۔ یہ جزیرہ یورپ سے منسلک رہا ہے، حالانکہ جغرافیائی طور پر یہ شمالی امریکی براعظم کا حصہ ہے اور کوپن ہیگن سے امریکا زیادہ قریب ہے۔

اس کے شمال میں ہانس جزیرہ پر ابھی حال تک کینیڈا اور ڈنمارک کے درمیان سفارتی کشیدگی رہتی تھی۔ ۲۰۲۲ء میں ہی دونوں ممالک نے اس جزیرہ کے بیچ میں لکیر کھینچ کر اس کو بانٹ کر اس قضیہ کو حل کر دیا، ورنہ ۱۹۸۴ء سے ایک معاہدہ تھا کہ دونوں ممالک کی فوجیں باری باری ہانس جزیرے پر پٹرول ڈیوٹی پر آتی تھیں۔

ڈنمارک کی افواج پٹرول ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد وہاں ڈینیش شراب کی بوتلیں چھوڑ کر زمین پر ایک طرح کا دعویٰ جتاتے تھے، پھر کینیڈا کی فوجی یونٹ آتی تھی، اور جانے سے قبل کینیڈا کی مخصوص شراب برانڈ کی بوتلیں جزیرہ پر چھوڑ دیتے تھے۔ ایک وقت ایسا ہی حل سیاچن گلیشیر کے لیے بھی تجویز کیا جاتا تھا۔

کوپن ہیگن اور پھر نوک میں بریفنگ وغیرہ اور اس علاقے کی اسٹریٹجک اہمیت جاننے کے بعد ہمارے سینئر ساتھی شاستری راما چندرن نے پیش گوئی کی تھی کہ افغانستان کی طرز پر یہ خطہ جلد ہی گریٹ گیم کا میدان بننے والا ہے۔

حال ہی میں، امریکا کے منتخب صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی گرین لینڈ کو خریدنے کی تجویز، حتیٰ کہ عسکری قوت استعمال کرنے کی دھمکی دینا اور پھر یورپی ممالک کا ردعمل، اس بات کے واضح اشارے دے رہے ہیں کہ اس گریٹ گیم کا وقت آچکا ہے۔

جزیرے کے پگھلتے ہوئے برفانی ذخائر غیر استعمال شدہ وسائل کے خزانے سے پردہ اٹھا رہے ہیں۔ اس جزیرہ کی برفانی تہوں میں اندازاً ۹۰ ارب بیرل تیل اور دنیا کے ۳۰ فیصد گیس کے ذخائر اور جدید ٹیکنالوجی کے لیے ضروری نایاب معدنیات چھپے ہوئے ہیں۔

گو کہ ڈنمارک کے تحت یہ ایک نیم خودمختار علاقہ ہے، مگر آبادی کی اکثریت اس قبضے کو بیسویں صدی کی نوآبادیاتی ذہنیت کی پیداوار سمجھتی ہے۔ شاید اس جزیرہ کی سخت زندگی کی وجہ سے ڈنمارک مقامی آبادیاتی تشخص یا ڈیموگرافی بدلنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ گرین لینڈ میں درجہ حرارت منفی ۵۰ ڈگری سیلسیس تک گر سکتا ہے، اور وسائل کے نکالنے کی لاجسٹک مشکلات نے تجارتی استحصال کو سست کر دیا ہے۔

مگر ٹرمپ کے اعلان سے قبل ہی گرین لینڈ کے وزیراعظم میوٹے ایگڈے نے نئے سال کے خطاب میں ڈنمارک سے آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے 'نوآبادیاتی

زنجیروں' کو ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اس خطے کو اندرونی طور پر مکمل خودمختاری حاصل ہے۔ ڈنمارک گرین لینڈ کی خارجہ اور دفاعی پالیسیوں پر کنٹرول رکھتا ہے۔ اس کے باوجود مقامی حکومت کے وزیروں نے پچھلے چند سالوں میں چین کے دورے کیے ہیں اور چینی وفود کا اس جزیرے میں استقبال کیا ہے۔

جس وقت ہم نوک میں تھے، اسی وقت گرین لینڈ کے ایک وزیر ڈنمارک حکومت کی اجازت کے بغیر بیجنگ دورہ پر گئے تھے۔ ایگڈے نے کہا، 'ہمارے دوسرے ممالک کے ساتھ تعاون اور ہمارے تجارتی تعلقات صرف ڈنمارک کے ذریعے جاری نہیں رہ سکتے'۔ ۲۰۲۱ء سے گرین لینڈ کی قیادت کرنے والے ایگڈے، جو آزادی کی حامی پارٹی 'کمیونٹی آف دی پیپل' کے سربراہ ہیں، نے اشارہ دیا ہے کہ اپریل میں آنے والے پارلیمانی انتخابات کے ساتھ آزادی پر ریفرنڈم بھی کرایا جائے گا۔

انہوں نے کہا، 'گرین لینڈ کو ایک خودمختار ملک کے طور پر تسلیم کروانے کے فریم ورک پر پہلے ہی کام شروع ہو چکا ہے'۔ ادھر امریکا بھی ایک طویل عرصے سے گرین لینڈ کو ایک اہم اسٹریٹجک اثاثہ سمجھتا آیا ہے۔ سرد جنگ کے دوران، امریکا نے گرین لینڈ میں تھولے ایئربیس قائم کی، جو اس کے میزائل دفاعی نظام کا ایک اہم حصہ ہے۔ ڈنمارک کے افسران کا کہنا تھا کہ امریکا ہی گرین لینڈ میں پس پردہ آزادی کی حمایت کرتا آیا ہے۔

یہ بات تو اب طے ہے کہ آرکٹک ایک دور دراز سرحد نہیں رہا ہے۔ یہ عالمی سیاست کا ایک اہم میدان بن چکا ہے۔ ڈینش مصنف اور آرکٹک معاملوں کے ماہر مارٹن بروم کہتے ہیں کہ گرین لینڈ تو پہلے ایک دور دراز خطہ تھا۔ اس خطے تک وسائل پہنچانا ہی دردسر ہوتا تھا۔ لیکن اب جیسے جیسے گرین لینڈ کے وسائل اور اس کی اسٹریٹجک اہمیت نمایاں ہو رہی ہے، گرین لینڈ اور ڈنمارک اپنے تعلقات کو دوبارہ متعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سال ۲۰۲۳ء میں گرین لینڈ کی وزیر خارجہ ویوین موٹسفیڈٹ نے چین کا دورہ کیا، جس میں جزیرے کی شراکتوں کو متنوع بنانے کی کوششوں پر بات چیت ہوئی۔ انہوں نے اپنے دورے کے دوران، اقتصادی تعلقات، تجارت، اور آرکٹک تعاون کو مضبوط کرنے پر بات چیت کی۔

سال ۲۰۱۲ء میں ہی ایک چینی کارگو سمندری جہاز نیدرلینڈ کے روٹرڈم اور پھر ناروے کے ساحل سے ساز و سامان لاد کر بحرِ اوقیانوس کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے الٹی سمت بحر منجمد شمالی کی برفانی تہوں سے راستہ بنا کر قطب شمالی کو پار کر کے ایشیا کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔

ابھی تک اس سمندری راستے سے شاید ہی کسی کا کامیابی کے ساتھ گزر ہوا تھا۔ اس کے چند سال بعد ۲۰۱۳ء میں بھاری بھرکم چینی جہاز یونگ شنگ نے ۱۹ ہزار ٹن کا مال اسی راستے سے چینی بندرگاہ ڈالیان سے روٹرڈم پہنچایا۔ پوری مغربی دنیا کے لیے یہ ایک خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس جہاز نے تین ہزار میل کا یہ سفر ۳۵ دن میں مکمل کیا۔ نہر سویز کے راستے یہ سفر پچاس دن میں طے ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ایسی تنگ سمندری گزرگاہوں سے گزرنا پڑتا تھا، جن پر مغربی ممالک یا ان کے اتحادیوں کی اجارہ داری ہے، جو نازک اوقات میں مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔

چین نے آرکٹک کونسل میں آبزرور کی حیثیت سے ممبر شپ بھی لی تھی۔ اس آٹھ رکنی کونسل میں امریکا، روس، کینیڈا، ڈنمارک، آئس لینڈ، ناروے، فن لینڈ اور سویڈن شامل ہیں۔ چین کی اس تگ و دو کو دیکھ کر بھارت نے بھی پھر ۲۰۱۳ء میں آرکٹک کونسل میں بطور مبصر ممبر شپ لی۔ لیکن اس کے لیے اس کو ڈنمارک کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار کر کے کڑوی گولی نگلنی پڑی۔ ۲۰۱۴ء میں بھارت نے اپنی پہلی ملٹی سینسر مانیٹرنگ آبزرویٹری، انڈآرک، آرکٹک گلیشیرز کی نگرانی کے لیے نصب کی۔

چین کے گرین لینڈ میں بڑھتے ہوئے مفادات نے مغربی طاقتوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ قطب شمالی کی جغرافیائی سیاست کی ماہر الزبتھ بکانن کا کہنا ہے کہ چین اور روس کی اس خطے میں بڑھتی دلچسپی کہیں اس کو دوسرا یوکرین نہ بنا دے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ خطہ اسلحے کی نئی دوڑ کا مرکز بن جائے گا۔ روس بھی اپنے آرکٹک عزائم کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ ۲۰۰۷ء میں، اس نے ایک علامتی عمل کے طور پر قطب شمالی کے سمندر میں روبوٹ بھیج کر تہہ پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ چین نے تجویز دی تھی کہ قطب جنوبی کی طرح قطب شمالی بھی کسی ملک کی ملکیت میں نہ ہو، مگر سائنسی تجربات کرنے کے لیے سبھی کو رسائی دی جائے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران، امریکا نے اس علاقے پر مختصر عرصہ تک قبضہ کر کے اس کا دفاع کیا تھا۔ کیونکہ ڈنمارک پر ان دنوں نازی جرمنی نے قبضہ کیا تھا۔ جنگ کے بعد ۱۹۴۶ء میں، امریکا نے گرین لینڈ کو خریدنے کی پیشکش کی تھی، لیکن ڈنمارک نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ ۱۹۷۹ء میں ڈنمارک نے گرین لینڈ کو داخلی خودمختاری دی۔

آرکٹک کے لیے ڈنمارک کے سفیر، کلاوس اے ہولم کا کہنا ہے کہ اس خطے نے تیل کی نکاسی کی صلاحیت، معدنیات اور بحری ٹریفک میں اضافے کی وجہ سے سیاسی اور اقتصادی اہمیت حاصل کی ہے۔ مگر یہ سبھی اقدامات ماحول کے لیے خطروں سے پُر ہیں۔ مصنف مارٹن برائم، جنہوں نے قطب شمالی کا دورہ بھی کیا ہے، کا کہنا ہے کہ اس خطے کی اقتصادی اہمیت کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ 'ہاں، یہاں معدنی ایندھن کے ذخائر ہیں، لیکن کسی بھی کاروباری منصوبے کے لیے ان کی نکاسی غیر منافع بخش ہے۔ ان کو نکالنے میں کافی وسائل کی ضرورت ہے'۔

تاہم ان کا کہنا ہے کہ برف پگھلنے اور موسمیاتی تبدیلی نے برف کی تہوں کو پتلا کر کے جو سمندری راستے نکالے ہیں، ان کی وجہ سے امریکا اور ایشیا قریب آ رہے ہیں۔ ایشیائی طاقتوں کو اس سے امریکی پانیوں میں کھیلنے کا موقع مل رہا ہے، جس کا امریکا کسی طور پر متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی مونروڈاکٹرائن یعنی کہ امریکی براعظم صرف امریکی ملکوں کا ہے، زمین بوس ہو رہا ہے۔

آبی راستوں پر قابو پانے سے ممالک بااثر اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ آرکٹک کو ایک قابلِ عمل آبی گزرگاہ بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری اور بین الاقوامی تعاون کی ضرورت ہے، جس میں تلاش اور بچاؤ کی سہولیات کے قیام کے ساتھ ساتھ تیل کے اخراج کو روکنے کے لیے ایک طریقہ کار بھی وضع کیا جانا شامل ہے۔

ڈنمارک اور روس کے قطب شمالی پر مضبوط علاقائی دعووں کے ساتھ، امریکا گرین لینڈ کو ایک آزاد ریاست بننے کے لیے اُکسا رہا ہے، آرکٹک خطے کو ایک بین الاقوامی ورثہ اور غیر وابستگی کا زون بنانے کی بھی تجاویز دی جا رہی ہیں۔ مگر بڑی طاقتیں شاید ہی اس پر کان دھریں گی۔ گزشتہ ۱۰ سالوں میں، گرین لینڈ نے اسکاٹ لینڈ کی کیرن، روس کی گازپروم اور ناروے کی اسٹیٹ آئل سمیت تیل اور گیس کے بڑے کھلاڑیوں کو معدنیات کو تلاش اور کانکنی کے کئی لائسنس دیے ہیں۔

اس کے آس پاس کے پانیوں میں پانامہ تک چین کا اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے۔ چین کی تگ و دو کو دیکھ کر ۲۰۲۰ء میں، امریکا نے گرین لینڈ میں اپنا قونصل خانہ دوبارہ کھولا، جو ۱۹۵۳ء سے بند تھا۔ اس نے گرین لینڈ کے لیے دو اقتصادی امدادی پیکجوں میں بھی توسیع کی ہے اور نایاب زمین کی معدنیات کی حکمرانی اور تلاش میں تعاون کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ دیکھنا باقی ہے کہ ٹرمپ کے گرین لینڈ کو آزادی دلوانے یا اس کو امریکی کالونی بنوانے پر چین اور روس کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ قطب شمالی نیز گرین لینڈ دوسری گریٹ گیم کا مرکز بن رہے ہیں۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۵ جنوری ۲۰۲۵ء)

ٹرمپ کے مبہم بیانات، غزہ معاہدے کا مستقبل؟

ملیحہ لودھی

نومنتخب امریکی صدر نے غزہ میں جنگ بندی پر زور دیا اور پھر فیصلہ کُن سفارت کاری کرتے ہوئے اسے ممکن بنایا لیکن اب جنگ بندی سے متعلق ان کے مبہم بیانات کہ امن معاہدہ قائم رہے گا نہیں، پریشان کُن ہیں۔ صدارتی دفتر سنبھالنے کے بعد ڈونلڈ ٹرمپ سے امن معاہدے سے متعلق سوال پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ معاہدہ کتنا عرصہ قائم رہے گا، اس پر وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے اور ساتھ ہی زور دیا کہ 'یہ ہماری جنگ نہیں، ان کی جنگ ہے'۔ ان کے اس بیان نے لوگوں کو تذبذب میں مبتلا کیا ہے کیونکہ وہ تو ۱۵ماہ بعد ہونے والی جنگ بندی کا سہرا اپنے سر لے رہے تھے۔ انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر ان کی تقریبِ حلف برداری سے قبل یرغمالیوں کو رہا نہیں کیا گیا تو 'مشرقِ وسطیٰ جہنم بن جائے گا'۔

اسی دوران ڈونلڈ ٹرمپ کے مشرقِ وسطیٰ کے خصوصی مندوب اسٹیو ویٹکوف نے اعلان کیا کہ وہ 'نگران ٹیم' کے ہمراہ جلد خطے کا دورہ کریں گے اور جائزہ لیں گے کہ دونوں فریقین جنگ بندی معاہدے پر عمل درآمد کو یقینی بنا رہے ہیں یا نہیں۔

مغربی کنارے کے اسرائیلی آبادکاروں پر پابندیاں اٹھا کر ٹرمپ انتظامیہ نے غزہ امن معاہدے کے حوالے سے مبہم اشارہ دیا ہے۔ گزشتہ سال بائیڈن انتظامیہ نے فلسطینی دیہاتیوں پر آبادکاروں کے پُرتشدد حملوں کی وجہ سے پابندیاں عائد کی تھیں۔ پابندیاں اٹھانے کا صدارتی فیصلہ ایک ایسے وقت میں کیا گیا کہ جب اسرائیلی آبادکار فوج کی سرپرستی میں فلسطینیوں پر حملے کر رہے تھے اور ان کی املاک کو نذرِ آتش کر رہے تھے۔ مغربی کنارے پر اسرائیلی حملوں میں شدت آئی ہے جبکہ جنین پناہ گزین کیمپ پر چھاپے مارے گئے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے اہلکاروں کے مطابق ۲ ہزار خاندانوں کو زبردستی نقل مکانی پر مجبور کیا گیا تھا، جس کے بعد انہوں نے کیمپ میں پناہ لی لیکن وہ کیمپ بھی مسلسل چھاپوں کی وجہ سے 'تقریباً ناقابلِ رہائش' ہو چکے ہیں۔

پابندیاں اٹھانے کے ایک دن بعد اسرائیل نے مغربی کنارے میں آئرن وال نامی 'وسیع' فوجی آپریشن کا آغاز کیا۔ اسرائیل محسوس کر رہا ہے کہ پابندیاں اٹھا کر واشنگٹن نے اسرائیل کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ دوسری جانب ٹرمپ انتظامیہ کے اقوامِ متحدہ کے نئے ایلچی ایلیس اسٹیفانیک نے کانگریس کو بتایا کہ اسرائیل کو مقبوضہ مغربی کنارے پر قبضے کا حق بائبل نے دیا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کے ماہرین، مغربی کنارے پر اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کا مقصد غزہ جنگ بندی سے توجہ ہٹانا قرار دیتے ہیں، جس کی بن یامین نیتن یاہو کی کابینہ کے انتہائی دائیں بازو کے رہنماؤں نے شدید مخالفت کی تھی۔ ان کے خیال میں حکومت دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور جنگ بندی معاہدہ درحقیقت ناکامی ہے۔ تاہم کابینہ اراکین نے یہ نظرانداز کر دیا کہ اسرائیل کے چھاپوں اور ڈرون حملوں کا آغاز جنگ بندی سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

یہ صرف ایک خلفشار نہیں بلکہ ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔ اسرائیل کا مقصد بالآخر مغربی کنارے کا الحاق ہے اور اسے لگتا ہے کہ اس مقصد کے لیے اسے ڈونلڈ ٹرمپ کی انتظامیہ کی حمایت حاصل ہو سکتی ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ میں جگہ بنانے والے بہت سے عہدیداران بشمول مائیک ہکابی جنہیں اسرائیل میں اگلے امریکی سفیر کے طور پر مقرر کیا گیا ہے، نے بھی عوامی طور پر مغربی کنارے پر اسرائیل کے دعوے کی حمایت کی ہے۔

اگر اسرائیل نے مغربی کنارے کو ضم کیا تو کبھی بھی ایک آزاد فلسطین ریاست کا قیام ممکن نہیں ہو سکے گا جبکہ دو ریاستی حل کا تصور بھی ختم ہو جائے گا، جس کے حوالے سے دنیا میں بڑے پیمانے پر اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے جبکہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادیں بھی دو ریاستی حل کے حق میں ہیں۔

امریکا اب بھی باضابطہ طور پر دو ریاستی حل کی حمایت کرتا ہے تاہم ٹرمپ نے اس کی توثیق سے گریز کیا ہے جبکہ بنیامین نیتن یاہو تو اسے بارہا مسترد کر چکے ہیں۔ گزشتہ ہفتے اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتریس نے ڈیووس اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے خبردار کیا تھا کہ مغربی کنارے کا الحاق بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہوگی۔

دوسری جانب غزہ میں فلسطینی اپنے تباہ حال گھروں کی جانب واپس آ رہے ہیں تو اب نقصانات واضح ہو رہے ہیں۔ مسمار عمارتوں کے ملبے تلے مزید شہدا کی لاشیں برآمد ہو رہی ہیں۔ ۱۵ماہ کی جنگ میں ۴۷ ہزار افراد شہید ہوئے جبکہ اب شہدا کی تعداد میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

غزہ ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے جہاں بنیادی خدمات کا نظام مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے مگر زندگی آہستہ آہستہ لوٹ رہی ہے۔ انسانی امداد فوری طور پر پہنچائی جا رہی ہے لیکن غزہ کی تعمیرِ نو کے لیے بڑے پیمانے پر انسانی اور بحالی کی کوششوں کی ضرورت ہوگی جبکہ وسائل اور دیرپا امن کے بغیر غزہ کی بحالی ممکن نہیں۔

اب تک جنگ بندی قائم ہے لیکن اس عمل میں سنگین چیلنجز کا سامنا ہے۔ حماس اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی معاہدے کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ ۶ ہفتوں پر مشتمل ہے، جس میں اسرائیلی یرغمالیوں اور فلسطینی قیدیوں کا تبادلہ ہوگا جو کہ اس وقت مرحلہ وار جاری ہے۔ اسرائیلی افواج کو فلسطینی آبادی والے علاقوں سے نکلنا ہوگا اور غزہ میں انسانی امداد کے داخلے کی اجازت دینا ہوگی۔

پہلے مرحلے کو ۱۶روز گزر چکے ہیں، اب دوسرے مرحلے کے لیے مذاکرات زیادہ دشوار ہوں گے۔ قیدیوں کے تبادلے کے درمیان اسرائیلی افواج کا غزہ سے انخلا عمل میں آ چکا ہے جبکہ جنگ کے خاتمے پر مکمل اتفاق ہو چکا ہے۔ تیسرا مرحلہ غزہ کی تعمیرِ نو پر مرکوز ہوگا۔ اس بارے میں خدشات ہیں کہ کیا جنگ بندی پہلے مرحلے تک قائم رہے گی؟ کیا دونوں فریق دوسرے مرحلے میں دیرپا جنگ بندی پر متفق ہو سکیں گے اور اس پر قائم رہیں گے؟

جنگ بندی معاہدے کے حوالے سے امریکا کے عزائم اور اس کا کردار معاہدے پر عمل درآمد کو یقینی بنائے گا۔ امریکا، قطر اور مصر کے ساتھ معاہدے کا ثالث ہے۔ جب تک امریکا اسرائیل پر دباؤ نہیں ڈالے گا تب تک امن معاہدے کا مستقبل بے یقینی کا شکار ہے۔ حلف برداری کے بعد ڈونلڈ ٹرمپ کا بیان کسی صورت بھی حوصلہ افزا نہیں۔

جیسا کہ بہت سے تجزیہ کار کہہ چکے ہیں کہ وہ ۲۰۲۰ء کے ابراہم معاہدے کو مزید آگے بڑھانے میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ اقدام جو انہوں نے اپنے پہلے دورِ صدارت میں لیا تھا جس کے تحت عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کی گئی۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی نظریں اب سعودی عرب پر جمی ہیں۔ انہوں نے میڈیا کو بتایا ہے کہ وہ سعودی عرب کو ابراہم معاہدے پر دستخط کے لیے آمادہ کر لیں گے۔ غزہ میں جنگ کے آغاز کے بعد سعودی عرب نے بات چیت کے عمل کو روک دیا تھا۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۰ \\\\\\

فلسطینیوں کو غزہ سے نکالنے کی تیاری؟

Betsy Klein & Lex Harvey

امریکا کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کہا ہے کہ اُنہوں نے غزہ میں تعمیرِ نو کے حوالے سے اردن کے شاہ عبداللہ سے بات کی ہے۔ ۱۰ لاکھ سے زائد فلسطینیوں کو غزہ سے نکال کر متعدد ممالک میں آباد کرنے کے حوالے سے بھی مشاورت ہو رہی ہے۔ دوسری بار امریکا کے صدر کے منصب پر فائز ہونے والے ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے ایک اچھا منصوبہ پیش کیا گیا ہے۔ صدر ٹرمپ نے بتایا کہ انہوں نے ۲۵ جنوری کو ایک فون کال کے دوران امریکا کے اہم پارٹنر اردن کے شاہ عبداللہ ثانی سے کہا کہ وہ مزید فلسطینیوں کو قبول کریں۔

ایئر فورس ون کی پرواز میں میڈیا کے نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہا کہ میں نے اردن کے شاہ سے کہا کہ وہ زیادہ سے زیادہ فلسطینیوں کو قبول کریں تاکہ غزہ میں تعمیرِ نو ممکن ہو سکے۔ اس وقت غزہ مکمل تباہ شدہ ہے۔ ملبہ ہٹانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی۔

اردن کی سرکاری خبر رساں ایجنسی 'پیٹرا' نے بتایا ہے کہ اردن کے شاہ عبداللہ ثانی نے امریکی صدر سے فون پر بات ضرور کی ہے تاہم فلسطینیوں کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اقوامِ متحدہ کے ریکارڈ کے مطابق اردن میں پہلے ہی تقریباً ۲۴ لاکھ رجسٹرڈ فلسطینی موجود ہیں۔

صدر ٹرمپ نے میڈیا کے نمائندوں کو بتایا کہ وہ مصر کے صدر جنرل عبدالفتاح السیسی سے بھی بات کریں گے کہ وہ مزید فلسطینیوں کو قبول کریں، بسائیں۔ مصر کی سرحد بھی غزہ سے ملتی ہے اور فلسطینی مصر کا رخ کرتے رہتے ہیں۔

صدر ٹرمپ کا کہنا تھا ''اس خطے میں سیکڑوں سال سے تنازعات اور قضیے رہے ہیں۔ جنگیں بھی ہوتی رہی ہیں اور بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی بھی کوئی نئی بات نہیں۔ غزہ کی تعمیرِ نو کے لیے لازم ہے کہ آبادی کو منتقل کیا جائے۔ ملبہ ہٹانے میں بھی وقت لگے گا اور اُس کے بعد تعمیرِ نو بھی وقت کی طالب ہے۔ غزہ کی حالت ایسی نہیں کہ تمام ہی فلسطینی وہاں سکون سے جی سکیں۔ ملبہ جلد از جلد ہٹانا ضروری ہے۔ لوگ مر رہے ہیں۔ عرب دنیا سے بات کر کے ہم فلسطینیوں کے لیے کہیں اور مکانات تعمیر کرنے کی کوشش کریں گے جہاں یہ لوگ سلامتی اور سکون کے ساتھ رہ سکیں۔ یہ ہاؤسنگ عارضی بھی ہو سکتی ہے اور مستقل بھی۔

مصر کی وزارتِ خارجہ نے کہا ہے کہ وہ فلسطینیوں کی جبری منتقلی کی حمایت کسی طور نہیں کرے گا۔ وزارتِ خارجہ نے امریکی صدر کا حوالہ نہیں دیا تاہم یہ ضرور کہا کہ مصر کبھی نہیں چاہے گا کہ فلسطینیوں کو اُن کے علاقوں سے کسی بھی بنیاد پر یا بزور نکالا جائے۔

مصری وزارتِ خارجہ نے فلسطینیوں کی منتقلی کے حوالے سے کہا کہ ایسے اقدامات سے خطے کی سلامتی داؤ پر لگتی ہے، مزید تنازعات کی راہ ہموار ہوتی ہے اور پُرامن بقائے باہمی کے مواقع کمتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اردن نے بھی کہا ہے کہ ہم فلسطینیوں کو اُن کی اپنی سرزمین پر آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اردن کے وزیرِ خارجہ ایمن صفادی نے کہا کہ ہم فلسطینیوں کو اُن کے علاقوں سے کہیں اور منتقل کرنے کے حق میں نہیں اور اس حوالے سے پالیسی تبدیل نہیں کی جائے گی۔ اردن کے باشندوں کے لیے اردن ہے اور فلسطینیوں کے لیے فلسطین۔ ایمن صفادی نے کہا کہ ہم امریکا میں نئی انتظامیہ کے ساتھ مل کر کام کرنے کو تیار ہیں۔ صدر ٹرمپ نے واضح طور پر کہا ہے کہ وہ خطے میں امن دیکھنا چاہتے ہیں۔

اردن کے وزیرِ خارجہ نے کہا کہ ہم دو ریاستوں کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہودیوں کے لیے اسرائیل اور فلسطینیوں کے لیے فلسطین۔

مصر کی وزارتِ خارجہ نے ایک بیان میں کہا کہ عالمی برادری کو فلسطینی ریاست کا وجود یقینی بنانے کی سمت کام کرنا چاہیے۔ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان پائے جانے والے قضیے کا یہی حل ہے۔

اسرائیلی چینل ۱۲ نیوز کے تجزیہ کار ایمٹ سیگل نے اسرائیلی حکام کے حوالے سے بتایا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ زبان کے پھسل جانے کا نتیجہ نہیں تھا۔ جو کچھ صدر ٹرمپ نے کہا وہ ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے اور یہ سب کچھ انہوں نے اسرائیل کے ساتھ مل کر طے کیا ہے۔

اس پورے معاملے سے بخوبی واقف ایک ذریعے نے اس کی تصدیق کی، تاہم تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ سی این این کی ٹیم نے اس حوالے سے تبصرے کے لیے امریکی محکمہ خارجہ سے رابطہ قائم کیا۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے ریمارکس امریکی پالیسی میں تبدیلی کا پتا دیتے ہیں۔ جو کچھ ٹرمپ نے کہا، وہ غزہ کی جنگ کے چھیڑے جانے کے سوا سال بعد کی بات ہے۔ اسرائیل اور حماس کے درمیان لڑائی کے نتیجے میں غزہ ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسرائیلی فضائی حملوں میں غزہ کی ۶۰ فیصد سے زائد عمارتیں یا تو تباہ ہو چکی ہیں یا اُنہیں شدید نقصان پہنچا ہے۔ ان میں اسکول اور اسپتال بھی شامل ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق ۹۲ فیصد مکانات رہنے کے قابل نہیں رہے۔

غزہ کے کم و بیش ۹۰ فیصد مکین اس وقت بے گھری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اِن میں بیشتر وہ ہیں جنہیں بار بار نقل مکانی کرنا پڑتی ہے۔ بعض نے تو دس بار ٹھکانے بدلے ہیں۔ یہ بات بھی اقوامِ متحدہ سے تصدیق شدہ ہے۔

امریکا ایک زمانے سے دو ریاستوں کے نظریے کی وکالت و حمایت کرتا آیا ہے۔ اب امریکی صدر کہہ رہے ہیں کہ فلسطینیوں کو اُن کے علاقوں سے نکال کر کہیں اور بسایا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غزہ کے قضیے کے حوالے سے امریکا اپنی پالیسی بدل رہا ہے۔ خطے میں ایک زمانے سے یہ خوف موجود رہا ہے کہ اسرائیل کی حکومت فلسطینیوں کو غزہ سے نکال کر علاقائی ممالک میں بسانا چاہتا ہے تاکہ پورے علاقے کو اپنا حصہ بنا سکے۔ اسرائیل کی حکومت اس سے انکار کرتی رہی ہے مگر مخلوط حکومت میں شامل انتہائی دائیں بازو کی جماعتوں کی تو یہی خواہش ہے۔

مصر کے صدر عبدالفتاح السیسی نے اکتوبر ۲۰۲۳ء میں شمالی غزہ سے دس لاکھ فلسطینیوں کو نقل مکانی پر مجبور کرنے کی اسرائیل کی پالیسی کی شدید مذمت کی تھی۔ یہ گویا ایک ایسے بڑے منصوبے کا حصہ تھا جس کا مقصد پورے علاقے سے فلسطینیوں کو نکال باہر کرنا ہے۔

عبدالفتاح السیسی کا کہنا تھا کہ غزہ کی پٹی سے فلسطینیوں کو بے دخل کر کے مصر میں دھکیلنے کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ بالکل ایسا ہی عمل مقبوضہ غربِ اردن کے فلسطینیوں کے ساتھ بھی کیا جائے گا یعنی اُنہیں اردن میں دھکیل دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں کسی فلسطینی ریاست کے وجود کے بارے میں بحث کرنے کی گنجائش ہی نہیں بچے گی کیونکہ زمین تو ہوگی مگر لوگ نہیں رہیں گے۔ اُسی زمانے میں اردن کے شاہ عبداللہ ثانی نے بھی کہا تھا کہ فلسطینی پناہ گزینوں کو اردن یا مصر میں

آباد ہونے پر مجبور کرنا ریڈ لائن ہے۔

حماس کے سینئر عہدیدار باسم نعیم نے کہا ہے کہ فلسطینی صدر ٹرمپ یا کسی اور کی طرف سے پیش کی جانے والی ایسی کوئی بھی تجویز قبول نہیں کریں گے جو ارضِ وطن چھوڑنے سے متعلق ہو۔ تعمیرِ نو لازم ہے۔ تعمیرِ نو نیک نیتی پر مبنی ہو سکتی ہے مگر اس کی آڑ میں فلسطینیوں کو اُن کی اپنی سرزمین سے نکال باہر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

آزاد فلسطینی سیاست دان ڈاکٹر مصطفیٰ برغوثی نے بھی صدر ٹرمپ کی تجویز کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''مجرمانہ بمباری اور قتلِ عام سے جو کچھ حاصل نہیں کیا جا سکا، وہ سیاسی دباؤ کے ذریعے حاصل کرنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی جائے گی۔ غزہ یا غربِ اردن میں نسلی تطہیر کی سازش کسی بھی صورت کامیاب نہیں ہونے دی جائے گی''۔

دنیا بھر میں فلسطینی پناہ گزینوں کی تعداد تقریباً ۵۹ لاکھ ہے۔ اِن میں سے بیشتر اُن فلسطینیوں کی اولاد ہیں جو ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے بعد اپنی سرزمین سے نکالے گئے تھے۔

امریکا کے سابق صدر جو بائیڈن نے مقبوضہ غربِ اردن میں ہلاکت خیز تشدد کی پاداش میں اسرائیلی آبادکاروں پر پابندیاں عائد کی تھیں۔ صدر ٹرمپ نے یہ پابندیاں ختم کر دی ہیں۔ اسرائیل کے وزیرِ خزانہ بیزیلل اسموترچ نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا تھا۔ اسموترچ نے مقبوضہ غربِ اردن میں اسرائیلیوں کو آباد کرنے کی زور و شور سے حمایت کی۔ اس حوالے سے بیزیلل نے ۲۰۰۵ء کے حکم نامے پر عمل کی وکالت کی ہے۔ بیزیلل نے، فطری طور پر، صدر ٹرمپ کے آئیڈیا کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ فلسطینیوں کو کسی معقول جگہ بسانا بہت اچھی بات ہوگی۔

یاد رہے کہ چند روز قبل صدر ٹرمپ نے کہا تھا کہ وہ غزہ میں تعمیرِ نو کی حمایت کریں گے کیونکہ غزہ سمندر کے کنارے واقع ہے اور اس کا موسم بھی بہت اچھا ہے۔

یہ رائے ٹرمپ کے داماد جیرڈ کُشنر کی ۲۰۲۴ء کی رائے سے بہت ملتی جلتی ہے۔ کُشنر نے کہا تھا کہ غزہ ساحل کے کنارے واقع ہے۔ یہ علاقہ بہت قیمتی ہے، اسرائیل کو تمام فلسطینی وہاں سے نکال دینے چاہئیں تاکہ علاقہ صاف ہو جائے۔

امریکی صدر ٹرمپ نے اس بات کی بھی تصدیق کی ہے کہ انہوں نے بائیڈن دور میں اسرائیل کو ۲ ہزار پاؤنڈ کے بم فراہم کرنے پر عائد پابندی ہٹا دی ہے۔ ٹرمپ کا یہ بھی کہنا تھا

////// باقی صفحہ نمبر ۸ \\\\\\

امریکی اِستعمار کو زندہ کرنے کی کوشش

Patrick Wintour

ایسا لگتا ہے کہ امریکی حکومت کو اب اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں کہ وہ باقی دنیا میں جو کچھ دیکھنا اور کرنا چاہتی ہے، وہ دراصل گزرے ہوئے زمانوں کے استعمار کے سوا کچھ بھی نہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے غزہ کو تحویل میں لینے کا جو اعلان کیا ہے، وہ ایک طرف تو اسرائیل کے انتہائی دائیں بازو کے سیاسی عناصر کی ذہنیت کا عکاس ہے اور دوسری طرف ڈونلڈ ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت کے دوران پروان چڑھنے والی استعماری ذہنیت کے درشن کرانے والا آئینہ بھی ہے۔ ٹرمپ نے پہلے دورِ صدارت میں بھی بہت سے معاملات کا عندیہ دے ہی دیا تھا۔ جب ٹرمپ کا پہلا دورِ صدارت شروع ہوا تھا تب ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ امریکا کو باقی دنیا سے الگ تھلگ کرنے کے موڈ میں ہیں اور یوں دنیا بھر میں امریکی عسکری مہمات کا اختتام اب نزدیک ہے مگر پھر اُنہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ امریکا اگر دوسروں کے معاملات سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دینے بھی لگا تو کمزور ممالک کو مُٹھی میں لینے اور مُٹھی کو بھینچے رکھنے کا عمل کسی طور ترک نہیں کرے گا۔ ٹرمپ کے پہلے دورِ صدارت کے اواخر تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ امریکا انیسویں صدی کے وسط میں پائے جانے والے امریکی استعمار کی راہ پر گامزن ہے۔

۴ فروری کو اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کے ساتھ صدر ٹرمپ کی پریس کانفرنس غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی۔ پوری پریس کانفرنس کے دوران نیتن یاہو صرف ایک لمحے کے لیے ناگوار موڈ میں دکھائی دیے۔۔۔ جب صدر ٹرمپ نے غزہ پر اسرائیل کے کنٹرول کے خلاف بات کی۔

اس پریس کانفرنس کے دوران ٹرمپ نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مشرقِ وسطیٰ ایک بار پھر امریکا کی خارجہ پالیسی کا کارنر اسٹون ہے اور یہ بھی کہ وہ فلسطینیوں کے برعکس، جو غزہ کو اپنا وطن گردانتے ہیں، غزہ کو ریئل اسٹیٹ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ غزہ کو ہتھیانے کا اعلان کر کے صدر ٹرمپ نے ایسی ہر خوش فہمی کو رفع کر دیا ہے کہ امریکا اب اپنی خارجہ پالیسی بدل رہا ہے اور دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے گریز کی راہ پر گامزن ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

صدر ٹرمپ نے کہا کہ امریکا اس بات کے لیے بھی تیار ہے کہ اپنی فوج غزہ کی سرزمین پر اتارے اور اُسے ایک طویل مدت کے لیے اپنے کنٹرول میں لے۔ امریکی صدر نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ وہ غزہ کی ملکیت چاہتے ہیں۔ اِس سے قبل ٹرمپ کہتے رہے ہیں کہ امریکا کو دنیا بھر میں الجھنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشرقِ وسطیٰ کی دلدل میں دھنسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ابھی یہ واضح نہیں کہ غزہ کے حوالے سے امریکی صدر کے اعلان کو امریکا اور یورپ میں کس حد تک مقبولیت حاصل ہو سکے گی۔ اسرائیل میں انتہا پسندوں کا گروہ اور امریکا میں عیسائی صہیونی یقیناً غزہ کو امریکی ملکیت میں دیکھنے کو ترجیح دے سکتے ہیں مگر عمومی سطح پر اس تصور کو مقبولیت ملتی دکھائی نہیں دیتی۔ مسلم ممالک سمیت دنیا بھر میں صدر ٹرمپ کے اعلان کو شدید ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھی صدر ٹرمپ کے بیان کو انتہائی غیر ذمہ دارانہ قرار دیا ہے۔ سلامتی کونسل کا کہنا ہے کہ یہ اعلان انتہائی غیر حقیقت پسندانہ اور معاملات کو بگاڑنے والا ہے۔ چین سمیت کئی بڑے ممالک نے بھی اس اعلان کو خام خیالی پر مبنی قرار دیا ہے۔

جو کچھ صدر ٹرمپ نے کہا ہے وہ آسانی سے قبول کیا جانے والا نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا کچھ بھی ہوا تو بہت زیادہ بگاڑ پیدا ہوگا مگر خیر پھر بھی صدر ٹرمپ کے اس بیان نے چند مقاصد تو حاصل کرنے کا اشارا دے ہی دیا ہے۔ اس سے بنیامین نیتن یاہو پر سے سیاسی دباؤ گھٹ گیا ہے۔ نیتن یاہو نے بائیڈن انتظامیہ کو ناراض کرنے سے بچنے کے لیے غزہ کے بارے میں کوئی بھی غیر حقیقت پسندانہ موقف اپنانے یا منصوبہ تیار کرنے سے گریز کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی کابینہ میں انتہائی دائیں بازو کے ارکان کو ناراض کرنے سے بھی بچنا چاہتے تھے۔ صدر ٹرمپ کے بیان نے اسرائیل میں انتہائی دائیں بازو کے ارکان کے دل کی بات کھل کر کہہ دی ہے۔ اُن سب کے دل کی تشفی ہوگئی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ یہ ایک بڑے منصوبے کا محض ایک حصہ ہے جس کے تحت صدر ٹرمپ اسرائیل کو اس بات کی اجازت دینا چاہتے ہیں کہ وہ مقبوضہ غربِ اردن کو بھی اپنی حدود میں شامل کر لے۔ ایسی صورت میں فلسطینیوں کا اپنی ریاست کے قیام کا مطالبہ یا

دعویٰ دفن ہوجائے گا۔ اگر فلسطینیوں کو اُن کی سرزمین سے نکالا گیا اور دوسرے ملکوں میں بسا دیا گیا تو پھر وہاں ہوگا کون جو ریاست کا دعویٰ کرے گا؟

بنیامین نیتن یاہو کو اس بات پر کسی قدر ناز ہوگا کہ امریکی صدر نے اُنہیں اپنے ساتھ بٹھا کر یہ بات کہی کہ غزہ اب ایسا تباہ شدہ علاقہ ہے جہاں لوگوں کو بسایا نہیں جاسکتا اور ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ غزہ کو اس حال تک پہنچانے والا کوئی اور نہیں اسرائیل ہے۔ ایک دنیا پر یہ بات واضح ہے کہ غزہ کو مکمل تباہی سے اسرائیل ہی نے دوچار کیا ہے اور اس حوالے صہیونی قیادت کو دنیا بھر سے تنقید کا سامنا رہا ہے۔ جنوبی افریقا نے اس معاملے میں چند قدم آگے بڑھ کر عالمی عدالتِ انصاف سے بھی رابطہ کیا۔

۴ فروری کی پریس کانفرنس سے قبل یہ اندازہ لگایا جارہا تھا کہ صدر ٹرمپ اسرائیلی وزیراعظم کو، جنہیں وہ سخت ناپسند کرتے رہے ہیں، حکم دیں گے کہ وہ مغویوں کے بدلے قیدیوں کی رہائی کے معاہدے کے دوسرے جُز کے مطابق فلسطینیوں کا رہائش کا حق تسلیم کریں اور اس طرف بڑھنا شروع کریں۔

صدر ٹرمپ نے غزہ کی زمین ہتھیانے کا جو اعلان کیا ہے، اُس نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ امریکی صدر نے غزہ کی صورتحال دیکھتے ہوئے جو کچھ بھی کہا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے لیے امریکا کے خصوصی ایلچی اسٹیو وِٹکاف کے تجزیے کی بنیاد پر ہے اور یہ تجزیہ غزہ کی زمین کو رئیل اسٹیٹ کے طور پر دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ اسٹیو وِٹکاف کا کہنا ہے کہ ''نیا دبئی'' تعمیر کرنے میں دس سال لگیں گے مگر اس سے قبل غزہ سے ملبہ ہٹانے میں کم و بیش پانچ سال لگ سکتے ہیں۔ غزہ بھر میں بہت بڑے پیمانے پر ملبہ پڑا ہوا ہے۔ عالمی ادارے اگر غزہ کے باشندوں کے لیے خطیر امداد دے بھی دیں تو وہ لوگ ابھی اِس سے مستفید ہونے کی پوزیشن میں نہیں۔

اسٹیو وِٹکاف کا کہنا ہے کہ فلسطینیوں کو غزہ سے نکال کر اُن سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ پانچ سال بعد واپس آسکتے ہیں کیونکہ اِس سے قبل اُن کے علاقے اس قابل نہیں ہوں گے کہ وہاں سکونت اختیار کی جاسکے۔ امریکا کے قومی سلامتی کے مشیر مائک والٹز کا کہنا ہے کہ یہ تو بالکل کامن سینس کی بات ہے۔ اسٹیو وِٹکاف اور مائک والٹز نے تاریخ کا مطالعہ بھی کیا ہے اور بین الاقوامی قانون بھی پڑھا ہے مگر دونوں بزرجمہروں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی ہے کہ امریکی صدر نے جو کچھ بھی کہا ہے اُس سے باقی دنیا کو یہی تاثر ملا ہے کہ امریکی صدر ایک بار پھر امریکا کو استعماری قوت دیکھنا چاہتے ہیں۔ گرین لینڈ اور کینیڈا کے حوالے سے بھی ٹرمپ نے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے دنیا کو یہ تاثر ملا ہے کہ وہ توسیع پسندانہ مہم جوئی کے ذریعے آج کی پیچیدہ دنیا کو مزید پیچیدہ بنانا چاہتے ہیں۔

صدر ٹرمپ نے غزہ کے حوالے سے جو ''وژن'' ظاہر کیا ہے، اُس میں بہت سے خطرات چھپے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہی خطرہ موجود ہے کہ حماس امریکی صدر کے اعلان کو ایک بنیادی سبب بناتے ہوئے جنگ بندی کے معاہدے یا عمل سے نکل سکتی ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ قیدیوں کے بدلے مغویوں کی رہائی کے اگلے مرحلے کی تکمیل سے انکار کردے۔ فی الحال حماس نے صدر ٹرمپ کے اعلان کو محض بے ہودہ اور بے عقلی پر مبنی قرار دینے پر اکتفا کیا ہے۔ حماس کی قیادت کا ردِعمل زیادہ شدید نہیں رہا ہے۔ وہ اِسے ایک بڑی بڑھک کے طور پر لے رہی ہے، اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔

قیدیوں کے بدلے مغویوں کی رہائی کے دوسرے اور اہم مرحلے کے لیے بات چیت شروع ہوچکی ہے۔ قطر کی طرف سے کیے جانے والے مذاکرات کے اعلان کے باوجود یہ خدشہ برقرار ہے کہ اگر فلسطینیوں نے تمام اسرائیلی مغویوں کو چھوڑ دیا تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امریکا تیزی سے غزہ کو اپنے کنٹرول میں لے کر فلسطینیوں کو نکالنا شروع کردے۔ ساتھ ہی ساتھ مقبوضہ غربِ اردن کو اسرائیل اپنا حصہ بنا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مجموعی طور پر لاکھوں فلسطینی مصر اور اردن میں پناہ لیں گے۔ اگر غزہ اور غربِ اردن کو خالی ہی کرالیا جائے تو پھر حماس یا فلسطینی اتھارٹی کی کیا ضرورت باقی رہ جائے گی؟

حماس کے لیے فی الحال اطمینان بخش بات یہ ہے کہ عرب دنیا اور یورپی یونین نے امریکی صدر کے اعلان کو غیر حقیقت پسندانہ قرار دے کر مسترد کردیا ہے۔ باقی دنیا بھی اس اعلان پر شدید ردِعمل کا مظاہرہ کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ غزہ سے نکالے جانے کی صورت میں لاکھوں فلسطینیوں کا بوجھ مصر اور اردن کو برداشت کرنا پڑے گا اور وہ کہہ چکے ہیں کہ وہ امریکی صدر کے ایسے کسی بھی منصوبے کا حصہ نہیں بنیں گے، پھر اِس میں چاہے جتنا بھی وقت لگے۔ مصر اور اردن نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ امریکا کی طرف سے چاہے کچھ بھی دیا جائے، وہ اپنی سوچ نہیں بدلیں گے اور فلسطینیوں کو ان کے وطن میں دیکھنے کو ترجیح دیں گے۔

امریکی صدر کو اس خیال کا حامل ہونا ہی چاہیے کہ وہ جلد یا بدیر غزہ پر امریکی کنٹرول کے آئیڈیا کو عرب دنیا کے لیے قابلِ قبول بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی دھونس اور دھمکی سے کام لینے سے گریز نہیں کریں گے۔ ابراہم اکارڈز کے معاملے میں بھی یہی تو ہوا تھا۔ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان نے کہا تھا کہ اگر اسرائیل دو ریاستوں کے تصور کو تبدیل کرلے تو سعودی عرب بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔

سعودی عرب کے حکام اور ذرائع نے بتایا ہے کہ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان اب تک اپنے موقف پر قائم ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ سعودی عرب اُسی وقت اسرائیل کو تسلیم کرے گا جب وہ دو ریاستوں کے نظریے کو تسلیم کرے گا۔ انہوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ وہ اپنا موقف تبدیل نہیں کریں گے۔ اُن کے موقف کے مطابق غزہ میں جو کچھ بھی اسرائیلی فوج اور اسرائیل قیادت نے کیا ہے، وہ قتلِ عام اور نسلی تطہیر ہے۔ امریکی ایوانِ صدر میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ تمام ہی عرب ریاستیں بکاؤ ہیں اور یہ کہ اگر امریکا اور اس کے حلیف چاہیں تو اِنہیں کسی بھی قیمت پر خرید سکتے ہیں۔ یہ تصور اس لیے مکمل طور پر غیر متعلق نہیں کہ عرب دنیا ایسی ہی رہی ہے۔ امریکا اور یورپ سے مکمل طور پر مرعوبیت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے عرب دنیا کے قائدین اور اشرافیہ دونوں ہی نے متعدد مواقع پر انتہائی پژمردگی اور نیم دِلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

امریکی صدر بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت جو بھی ماحول ملک کے اندر ہے، اُس کے مطابق امریکا خود کو نسلی تطہیر سے جوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ نگورنو کاراباخ میں جو کچھ ہوا وہ دنیا کے لیے اہم بھلے ہی نہ ہو اور وہ نظر انداز کرتی رہی ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر غزہ سے فلسطینیوں کو نکال باہر کیا گیا تو مشرقِ وسطیٰ میں امریکا کا سیاسی کردار بالکل ختم ہوکر رہ جائے گا۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Trump's plan to own Gaza a throwback to 19th-century imperialism".
("The Guardian". February 5, 2025)

بقیہ: فلسطینیوں کو غزہ سے نکالنے کی تیاری؟

کہ اسرائیل کو ان بموں کا ایک مدت سے انتظار ہے۔ وہ ادائیگی کرچکا ہے اور ہم نے ڈلیوری کی اجازت دے دی ہے۔ یہ بم اسرائیل کو بہت جلد مل جائیں گے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Trump suggests his plan for Gaza Strip is to clean out the whole thing."
("amp.cnn.com." January 26, 2025)

فلسطینی پَسپا ہوں گے، نہ دَست بَردار

Yara Hawari

(امریکا اور اسرائیل نے مشرقِ وسطیٰ کے معاملات کو ڈانواڈول رکھنے کی جو جامع حکمتِ عملی تیار کر رکھی ہے، اُس پر بھرپور جوش و خروش کے ساتھ عمل جاری ہے۔ اس معاملے میں دونوں ہی نے باقی دنیا کی مخالفت اور تنقید کو جوتے کے نوک پر رکھا ہے۔ اسرائیلی قیادت نے فلسطینیوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں، وہ دنیا کے سامنے ہیں۔ ایک دنیا نے اس حوالے سے اسرائیل اور امریکا دونوں ہی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یورپی یونین اس معاملے میں خود کو امریکا سے الگ تھلگ رکھتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب بھی ناقابلِ فہم نہیں۔ یورپی یونین کو بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ جو کچھ بھی امریکا اور اسرائیل نے فلسطین کے حوالے سے کیا ہے، وہ عالمی سیاست پر دور رس اثرات کا حامل ہے۔ اس حوالے سے عالمی برادری کے ردِعمل کو یکسر نظر انداز کرنے کا نتیجہ مزید خرابیوں کی شکل میں برآمد ہوگا۔

دنیا بھر کے تجزیہ کار اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ عالمی اداروں کو آگے بڑھ کر اسرائیل اور امریکا، دونوں ہی کو لگام ڈالنی چاہیے۔ ابھی تک تو اس کے آثار نہیں۔ اب امریکا اور اسرائیل نے بہت زیادہ کُھل کر اپنے ارادوں کا محض اعلان نہیں کیا ہے بلکہ عملی سطح پر بھی بہت کچھ کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ عالمی برادری محض تماشائی بنے رہنے کی مزید متحمل نہیں ہوسکتی۔)

فلسطینیوں نے پیغام دے دیا ہے۔ انہوں نے پوری دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے، ہم غزہ میں رہیں گے، کہیں اور نہیں جائیں گے، کسی اور ملک میں نہیں بسیں گے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ فلسطینیوں نے ہر طرح کے اور ہر سطح کے مظالم برداشت کیے ہیں۔ قتل و غارت، تباہی، معاشی خرابی سبھی کچھ تو وہ جھیلتے رہے ہیں۔ انہیں ایک بار نہیں، کئی بار گھروں سے نکالا گیا ہے۔ ایک سال اور تین ماہ سے زائد مدت کے دوران انہوں نے قتل و غارت کے نتیجے میں بے گھری، افلاس اور خوراک کی قلت کا عذاب کُھل کر جھیلا ہے۔ لاکھوں فلسطینی آج بھی اپنے مادرِ وطن سے بہت دور علاقائی ممالک اور دیگر خطوں میں آباد ہیں۔ ہر دور میں فلسطینیوں کا ایک ہی پیغام رہا ہے، ہمت ہارنے اور ہتھیار ڈالنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کوئی اس حقیقت کو تسلیم کرے یا نہ کرے، معاملہ یہ ہے کہ فلسطینیوں نے ہر عہد میں اپنے آپ کو منوایا ہے۔ اپنے سے کہیں بڑی طاقت کے سامنے وہ سینہ سپر رہے ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسرائیل کچھ نہیں، اُس کی پشت پر امریکا اور یورپی یونین موجود رہے ہیں۔ اب یورپی یونین نے راستہ بدلا ہے مگر خیر یہ بات پورے یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ یورپی یونین نے اپنی پالیسی مکمل طور پر بدل لی ہے اور اب کسی بھی معاملے میں اسرائیل کی معاونت کے لیے آگے نہیں بڑھے گی۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکی صدر کا منصب دوسری بار سنبھالنے کے بعد پہلے پندرہ دنوں ہی میں یہ واضح پیغام دے دیا ہے کہ وہ فلسطینیوں کو اُن کے علاقوں سے مکمل طور پر نکال باہر کرنے کی اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کی پالیسی کے مکمل حامی ہیں اور اس معاملے میں عملی سطح پر بھی بہت دور تک جانے کے لیے تیار ہیں۔

صدر ٹرمپ نے ۴ فروری کو اسرائیلی وزیراعظم کے ساتھ پریس کانفرنس کے دوران یہ واضح کر دیا کہ غزہ کو امریکا اپنے کنٹرول میں لینا چاہتا ہے اور یہ کہ اب فلسطینیوں کو غزہ سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اس اعلان پر بہت لے دے ہوئی ہے۔ دنیا بھر کے قائدین نے صدر ٹرمپ کو اس بیان کے حوالے سے خوب لتاڑا ہے۔ یورپی یونین میں بھی اس حوالے سے شدید ردِعمل دکھائی دیتا ہے۔ یہ اعلان ہر اعتبار سے قابلِ مذمت اور پریشان کن ہے۔ امریکا دنیا بھر میں الجھا ہوا رہا ہے۔ آج بھی اُس کے فوجی متعدد ممالک کی سرزمین پر تعینات ہیں۔ جاپان اور جنوبی کوریا اس معاملے میں بالکل واضح مثال کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایسے میں صدر ٹرمپ کی طرف سے غزہ کو کنٹرول میں لینے کا اعلان انتہائی خطرناک ہے کیونکہ ایسی صورت میں خطے کی صورتحال مزید خراب ہوگی اور عسکری مہم جوئی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیتن یاہو کے ساتھ پریس کانفرنس سے قبل ہی اس بات کے آثار تھے کہ ڈونلڈ ٹرمپ غزہ کے حوالے سے کوئی ایسا ویسا بیان جاری کرنے والے ہیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔

اسرائیل کے وزیراعظم صدر ٹرمپ کی دوسری حلف برداری کے بعد امریکا کا دورہ کرنے والے پہلے غیر ملکی سربراہِ حکومت ہیں۔ یہ دورہ دونوں ملکوں کی دوستی کو دیکھتے ہوئے کسی بھی سطح پر حیرت انگیز نہ تھا۔ صدر ٹرمپ نے، جیسی کی توقع تھی، منصب سنبھالنے کے بعد پہلی تقریر میں اپنی گزشتہ دورِ صدارت کی کامیابیاں گنوائیں جن میں سے بیشتر بین الاقوامی قانون کے تحت یکسر غیر قانونی تھیں۔ انہوں نے امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے مقبوضہ بیت المقدس منتقل کرنے کو بھی اپنی بڑی کامیابی قرار دیا۔ گولان کی پہاڑیوں کو غیر قانونی طور پر اسرائیل کی تحویل میں دینا اور ابراہم اکارڈز بھی اُن کی نظر میں بہت بڑی کامیابی ہیں۔ اپنی سابق نام نہاد کامیابیوں کا راگ الاپنے کے بعد صدر ٹرمپ نے غزہ کے حوالے سے امریکی منصوبے کا اعلان کیا۔ یہ چونکانے والا لمحہ تھا کیونکہ کسی کو اندازہ نہ تھا کہ وہ غزہ کے حوالے سے ایسی بات بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے غزہ پر امریکی کنٹرول کی بات کی۔

صدر ٹرمپ کے اب تک کے یعنی دوسری مدتِ صدارت کے حوالے سے کیے جانے والے اعلانات اور اقدامات تضادات کا مجموعی ثابت ہوئے ہیں۔ پہلے انہوں نے کہا کہ غزہ میں تعمیرِ نو کی گنجائش نہیں۔ پھر کہا اگر تعمیرِ نو ہوگی تو امریکا ہر مرحلے پر قائدانہ کردار ادا کرے گا۔ پہلے انہوں نے کہا کہ غزہ سے تمام فلسطینیوں کو نکلنا ہوگا۔ پھر کہا کہ امریکا اس علاقے کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرے گا جو تمام ہی لوگوں کے لیے ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ فلسطینی غزہ میں سکونت پذیر رہ سکتے ہیں۔

مشترکہ پریس کانفرنس کے دوران ڈونلڈ ٹرمپ نے جو کچھ کہا وہ سب کا سب نیتن یاہو سے ہضم نہ ہوسکا۔ جب ٹرمپ نے کہا کہ اُن کی انتظامیہ غزہ کو اپنے کنٹرول میں لینا چاہے گی تو نیتن یاہو تھوڑے سے کنفیوزڈ دکھائی دیے۔ ساتھ ہی ساتھ بات سمجھنے سے بھی وہ بہت حد تک قاصر رہے کہ امریکا غزہ میں اپنے فوجی تعینات کرے گا یا نہیں۔ جو کچھ بھی صدر ٹرمپ نے کہا، وہ ابہام کے پردوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دو ہفتوں کے دوران صدر ٹرمپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ ان کے ارادوں کو دنیا پر ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے گرین لینڈ کو بھی امریکا کے کنٹرول میں لینے کی بات کہی ہے۔ ساتھ ہی وہ کینیڈا کو لپیٹے میں لینے کی بات بھی کر چکے

ہیں۔سوچنے والے سوچ رہے ہیں کہ جب کینیڈا یا گرین لینڈ پر نظریں جمائی جاسکتی ہیں تو پھر غزہ کیا چیز ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کسی بھی خطے کو ہڑپ کرنا بہت بڑا معاملہ ہے۔وہ زمانے اب نہیں رہے کہ کوئی بھی طاقت کسی بھی ملک یا خطے کو ہڑپ کرلے اور شور نہ اٹھے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کی دوسری حلف برداری کے ایک ہفتے بعد ہی امریکا نے مصر اور اردن پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ وہ اپنے علاقوں سے بے دخل ہونے والے فلسطینیوں کو قبول کرلیں اور اس کا بنیادی مقصد غزہ کو صاف کرنا تھا۔ مین اسٹریم میڈیا میں بہت سے تجزیہ کار اگرچہ اس عمل کی مخالفت کررہے ہیں مگر وہ بھول رہے ہیں کہ جب غزہ میں قتلِ عام شروع ہوا تھا تب بائیڈن انتظامیہ نے بھی بے گھر ہونے والے فلسطینیوں کو مصری سینائی کے علاقے میں بسانے کا آئیڈیا مارکیٹ میں پھینکا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بائیڈن انتظامیہ نے اسرائیلی فوج کو ہتھیاروں کی فراہمی جاری رکھی تھی جس کے نتیجے میں اُس نے کم وبیش ساٹھ ہزار فلسطینیوں کو شہید کیا۔

جو کچھ ٹرمپ نے کرنے کا عندیہ دیا ہے، وہ بہت حد تک بائیڈن بھی کرچکے ہیں۔اس حوالے سے ردِعمل منتخب نوعیت کا رہا ہے۔بعض معاملات بہت خطرناک تھے مگر اُن کے بارے میں ردِعمل زیادہ شدید نہیں رہا۔چند معاملات اگرچہ بہت اہم بھی نہ تھے اور اُن سے بہت زیادہ نقصان کا اندیشہ بھی نہ تھا مگر پھر بھی بہت شور مچایا گیا۔یہ بھی مین اسٹریم میڈیا کی بے دیانتی ہے۔ہمیں ٹرمپ کے اگلے چار برس میں بہت سے نئے تضادات بھی دیکھنے کو ملیں گے اور چند پرانے تضادات بھی دہرائے جائیں گے۔

فلسطینیوں کے پاس اب صرف ایک چوائس رہ گئی ہے، یہ کہ اپنی سرزمین نہ چھوڑیں اور کسی بھی حالت میں اُس سے دست بردار یا کنارہ کش نہ ہوں۔جو کچھ ٹرمپ کہہ رہے ہیں، وہ اسرائیلی قیادت کی قتلِ عام جاری رکھنے کی پالیسی ہی کا تسلسل ہے۔غزہ کے ساتھ ساتھ مقبوضہ غربِ اردن میں بھی اسرائیلی فوج نے غیر معمولی پیمانے پر قتلِ عام کیا ہے اور اس حوالے سے دنیا کو دھوکے میں رکھا گیا ہے۔ جو کچھ بھی سوا سال کے دوران اسرائیل نے کیا، اُسے جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا جارہا ہے، بس الفاظ تبدیل کردیے گئے ہیں۔مقبوضہ غربِ اردن میں اسرائیلی فوج نے پناہ گزین کیمپ مسمار کردیے ہیں جس کے نتیجے میں ہزاروں فلسطینی بے گھر ہوچکے ہیں۔ بچوں سمیت درجنوں کو شہید کردیا گیا اور ہزاروں کو پورے علاقے سے نکال دیا گیا۔ پورے پورے علاقے تباہ کردیے گئے۔یہ حملہ بجائے خود فلسطینی زندگی پر حملہ ہے۔مقصد بالکل واضح رہے، فلسطینیوں کی زیادہ سے زیادہ زمین پر قبضہ کیا جائے۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تب فلسطینی محض تماشائی نہیں تھے اور تماشائی تو وہ کبھی نہیں رہے۔سوا سال کے دوران غزہ میں فلسطینیوں نے اسرائیلی جارحیت کا بھرپور جواب دیا ہے اور قتلِ عام یا نسلی تطہیر کے جواب میں جو مزاحمت کی جانی چاہیے، وہ انہوں نے کی۔ دنیا نے دیکھا کہ نہتے ہوتے ہوئے بھی وہ میدان میں ڈٹے رہے۔خوراک، پانی اور دواؤں کی شدید قلت کے باوجود انہوں نے مثالی نوعیت کی ثابت قدمی دکھائی۔انتہائی نوعیت کی تباہی کے باوجود انہوں نے اپنی سرزمین چھوڑنے سے انکار کردیا ہے۔

صدر ٹرمپ کی طرف سے غزہ کو کنٹرول میں لینے کے اعلان کے بعد دنیا بھر میں فلسطینیوں نے سوشل میڈیا کے ذریعے شدید ردِعمل ظاہر کیا ہے اور صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی زمینیں کسی بھی حال میں خالی نہیں کریں گے۔انہوں نے دنیا کے طاقتور ترین ملک کے سربراہ کو بتادیا ہے کہ وہ اپنے علاقوں سے، اپنی زمینوں سے دست بردار نہیں ہوں گے۔غزہ کے صحافی ابوبکر عبد نے لکھا یہ ہماری سرزمین ہے، کوئی اور ہمیں یہاں سے کیسے نکال سکتا ہے؟

یہ کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں، سات عشروں سے فلسطینیوں نے منظم قتلِ عام کا سامنا کیا ہے۔ اُنہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئی ہیں، معاشی مقاطعے کی کیفیت پیدا کی گئی ہے، معاشی ناکہ بندی کے ذریعے جھکانے کی کوشش کی گئی ہے۔انہیں آبائی علاقوں سے نکالنے کے لیے اسرائیلی فوج نے بہت جبر کیا ہے، بہت مظالم ڈھائے ہیں۔ فلسطینیوں نے کسی بھی مرحلے پر پیچھے ہٹنے کی بات نہیں کی۔وہ اِس طور ڈٹے رہے ہیں کہ دنیا حیرت سے دیکھتی رہ گئی ہے۔ امریکی صدر نے جو کچھ کہا ہے، وہ نسلی تطہیر کی پالیسی کا تسلسل ہی ہے۔ہاں، اتنا ضرور ہے کہ امریکی صدر نے فلسطینیوں کے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔

انتہائی نوعیت کی ہر صورتحال کا بھرپور قوت اور مثالی ثابت قدمی سے سامنا کرکے فلسطینیوں نے اسلامی روایات کو برقرار رکھا ہے۔ایک چھوٹے سے علاقے کو امریکا اور اُس کے حلیف ممالک نے اسرائیل کے ذریعے حصار میں لے کر زندگی سے نفرت پر مجبور کرنے کی کوشش کی ہے مگر اب تک وہ مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔فلسطینیوں نے ہر موڑ پر اپنے وجود کو منوایا ہے۔وہ مظالم جھیلنے کے معاملے میں پوری امت کے لیے روشن ترین مثال کا درجہ رکھتے ہیں۔مقدس سرزمین کو اللہ کی امانت سمجھتے ہوئے وہ ہر طرح کی سختیاں جھیلتے رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ارضِ فلسطین سے جُڑے رہنے پر انہیں انتہائی نوعیت کے جبر اور مظالم کا سامنا کرتے رہنا پڑے گا۔

امریکی صدر نے ایک ایسا اعلان کیا ہے جو اُن کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی امریکی پالیسیوں کا بھی عکاس ہے۔وہ بزنس مین ہیں اور غزہ کے علاقے کو ریئل اسٹیٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں اور دنیا کے سب سے طاقتور ملک کے سربراہ کی حیثیت سے اُن کا اعلان انتہائی عامیانہ اور شرمناک ہے۔جس علاقے کو تباہ کردیا گیا ہے اور جس علاقے کے لوگوں پر زندگی انتہائی دشوار کردی گئی ہے، اُسی علاقے پر قبضہ کرنے کا عندیہ دے کر صدر ٹرمپ نے لاکھوں فلسطینیوں کے زخموں پر نمک چھڑکا ہے اور اس حوالے سے عالمی برادری کو بھرپور ردِعمل کا اظہار کرنا چاہیے۔

(یارہ حواری فلسطینی پالیسی نیٹ ورک Al SHABAKA کے شریک ڈائریکٹر ہیں۔) (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Palestinians have a clear message for Donald Trump over Gaza: 'We are here, we won't leave'." ("The Guardian". February 5, 2025)

○○○

بقیہ: ٹرمپ کے مبہم بیانات، غزہ معاہدے کا مستقبل؟

سعودی قیادت نے واضح کیا ہے کہ اسرائیل جسے ولی عہد محمد بن سلمان نے نسل کشی کا مرتکب قرار دیا ہے، اس کے ساتھ تعلقات فلسطینی ریاست کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔کیا یہ فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ٹرمپ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کافی ہوگا، جس کے لیے انہوں نے کبھی زیادہ تشویش ظاہر نہیں کی جو کہ بے یقینی ہے۔تاہم مشرق وسطیٰ میں پائیدار استحکام آزاد فلسطینی ریاست کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

فی الحال مشرقِ وسطیٰ کا امن بے یقینی کا شکار ہے۔مغربی کنارے کے الحاق کی اسرائیل کی کوئی بھی کوشش معاہدے کو توڑ سکتی ہے۔اسی طرح اگر اسرائیل جنگ بندی معاہدے کی شرائط سے پیچھے ہٹتا ہے تو دوبارہ جنگ چھڑ سکتی ہے۔

"Risks to Gaza truce".
(Daily "Dawn" Karachi, January 27, 2025)

بنگلادیش: طلبہ انقلاب اور شیخ حسینہ کے ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ

چوتھی قسط

محمد نصیر الدین

آرمی کو قانون نافذ کرنے کے لیے پولیس کے اختیارات دیے گئے۔طلبہ رہنماؤں کی ہدایت پر یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ نے امن وامان کو بحال کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ان لوگوں نے ہر وہ کام کیا جس کے تعاون کی حکومت کو ضرورت تھی۔ اخبارات میں اشتہار کے ذریعے پولیس کو اپنی ڈیوٹیوں پر واپس آنے کا کہا گیا اور ساتھ ہی نئی بھرتیوں کا اعلان کیا گیا۔۶۳۹ پولیس اسٹیشنوں پر نئے SHO کا تقرر کیا گیا۔کافی محنت کے بعد نیا انتظامی ڈھانچہ کھڑا ہوا اور شہر میں امن وامان بہتر ہونا شروع ہوگیا۔

۱۶ر ستمبر کو ڈاکٹر یونس نے فوج کو جو مجسٹریٹ کے اختیارات دیے تھے اس سے بہت بہتری آئی، جو لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر چوری اور رہزنی، ڈکیتی میں مصروف ہوگئے تھے،فوج نے انہیں پکڑ کر فوری سزائیں دیں۔پولیس اور فوج نے طلبہ رہنماؤں کے ساتھ مل کر رات دن محنت کی۔اس سے ملکی حالات کافی بہتر ہوگئے۔

عوامی لیگ، چھاترو لیگ (اسٹوڈنٹ لیگ) اور جبولیگ (یوتھ لیگ) یہ تینوں دراصل عوامی لیگ کی ذیلی تنظیمیں ہیں۔ یہ سب پورے بنگلا دیش میں لوٹ مار میں مصروف تھے۔حسینہ کے فرار ہونے کے بعد یہ سب بھی وہاں سے فرار ہوگئے اور ان کی جگہ B.N.P کے Cadre (مسلح کارکنوں) نے سنبھال لی۔ بی این پی سے مراد خالدہ ضیاء کی پارٹی،عوامی لیگ کے بعد بنگلا دیش میں B.N.P بڑی پارٹی ہے۔انہیں عوامی سپورٹ حاصل ہے۔ ڈھاکا میں اُن کے لاکھوں فالورز ہیں۔ اُس وقت کی نئی حکومت اُن سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہتی تھی،لیکن یہ صورتِ حال بنگلا دیش کے عوام کو پریشان کررہی تھی۔

طلبہ رہنماؤں نے اس صورتِ حال کا جائزہ لیا اور ان سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ملک میں امن وامان کو قائم رکھا جاسکے۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ۱۵۰۰ر سے زائد طلبہ اس لیے شہید نہیں ہوئے تھے کہ عوامی لیگ بھاگ جائے اور B.N.P کے مسلح کارکن اُن کی جگہ لے لیں۔انہوں نے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ اُن شر پسند عناصر سے مقابلہ کے لیے میدان میں آئیں۔انہوں نے دینی جماعتوں سے بھی اپیل کی کہ وہ اس صورتِ حال کا جائزہ لیں اور طلبہ کی پکار پر میدان میں آئیں اور سب مل کر ان شر پسندوں کا مقابلہ کریں۔ فوج اور پولیس بھی اُن میں شامل ہوگئی اور یوں حالات تیزی سے بہتری کی طرف آ گئے۔ حالات تو بہتر ہوئے مگر B.N.P کو اس سے سیاسی طور پر بہت نقصان ہوا۔ لوگوں کو سمجھ آ گئی کہ B.N.P کا کردار بھی عوامی لیگ جیسا ہی ہے۔طلبہ رہنماؤں کی اس بات کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور سراہا کہ عوامی لیگ سے اختیارات لے کر B.N.P کے حوالے کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ہم ملک میں انصاف اور قانون کی حکمرانی چاہتے ہیں۔

طلبہ رہنماؤں کو سمجھ آ گئی کہ مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئیں بلکہ ابھی ان کا اور بھی سامنا کرنا پڑے گا۔لہٰذا انہوں نے ڈاکٹر یونس سے مطالبہ کیا کہ فوری طور پر کالج اور یونیورسٹیاں کھول دی جائیں، کیونکہ طلبہ اس انقلاب کے روح رواں ہیں،لہٰذا انہیں دوبارہ منظّم کیا جائے،انہیں صورت حال سے آگاہی دی جائے۔ چنانچہ پورے بنگلا دیش میں انہوں نے از سرِ نو طلبہ کو منظّم کیا۔سیمینار سمپوزیم کیے گئے۔تمام نوجوانوں کو حالات سے آگاہی دی گئی۔عوامی لیگ کی جانب سے کاؤنٹر ریوالوشن (Revolution) کا ذکر کیا اور طلبہ کو تیار رہنے کی ہدایت کی گئی۔

انصار باہنی (Ansar Force) کا حملہ

اچانک ایک دن انصار فورس نے سیکریٹریٹ کا گھیراؤ کیا، اُن میں ہزاروں انصار موجود تھے۔حسینہ حکومت نے یہ فورس بنائی تھی اور انہیں فوجی تربیت بھی دی تھی۔حسینہ واجد نے اس فورس کے لیے اپنے علاقے گوپال گنج سے زیادہ بھرتیاں کی تھیں۔اس فورس کی تعداد ۴۰ ہزار سے زیادہ تھی۔حسینہ واجد کی شہ پر انصار فورس نے سیکریٹریٹ پر دھاوا بولا۔سیکریٹریٹ کے لوگوں کو یرغمال بنایا اور پورے سیکریٹریٹ پر قبضہ کرلیا۔طلبہ رہنماؤں اور حکومت نے محسوس کرلیا کہ ان کا ارادہ خطرناک ہے اور یہ ڈاکٹر یونس کی حکومت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ان کو ہٹانے کے لیے فوج کے علاوہ کوئی فورس موجود نہیں تھی۔طلبہ نہیں چاہتے تھے کہ فوج کو اُن کے خلاف استعمال کیا جائے، کیونکہ فوج کے انکار کی صورت میں حکومت ختم ہوجاتی۔

طلبہ رہنماؤں نے نوجوانوں سے سیکریٹریٹ کے گھیراؤ کی اپیل کی۔ ڈھاکا میں لاکھوں طلبہ تعلیمی ادارے کھلنے سے ہاسٹلوں میں موجود تھے۔سب لڑکے لاٹھیاں اور ڈنڈے لے کر سیکریٹریٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ لاکھوں طلبہ کا جلوس تھا۔ دست بدست لڑائی ہوئی جس میں سیکڑوں طلبہ زخمی ہوئے۔ اسی طرح انصار والے بھی زخمی ہوئے۔ بالآخر اسٹوڈنٹس تعداد میں بھی زیادہ تھے، پُرعزم بھی تھے، منظّم بھی، اُن کے سامنے انصار فورس ٹھہر نہ سکی۔انہیں خوب مار پڑی، اُن کی بھاگتے ہوئے ویڈیوز میڈیا نے خوب نشر کیں۔طلبہ نے دور تک اُن کا پیچھا کیا۔انصار باہنی کے کمانڈر نے معافی مانگی اور فوج سے درخواست کی کہ انہیں پناہ دی جائے،اور اس طرح یہ خطرہ ملک پر سے ختم ہوا اور طلبہ کا کنٹرول برقرار رہا۔عوامی لیگ کو ایک دفعہ پھر نصیحت ہوئی کہ طلبہ منظّم اور پرعزم ہیں اور ملک کی آزادی کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہیں۔

۱۰ر نومبر کا واقعہ!

عوام کا خیال تھا کہ انصار فورس کی طلبہ کے ہاتھوں پسپائی کے بعد اب عوامی لیگ کوئی اور قدم نہیں اٹھائے گی۔مگر اُن کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی،انہوں نے ۱۰ر نومبر کو ڈھاکا میں بہت بڑے احتجاجی مظاہرے کا اعلان کیا۔سوشل میڈیا میں اس کی کمپین چلائی، اشتہارات دیے۔ بھارتی اخبارات اور ٹی وی چینلوں نے اس مظاہرے کی تشہیری مہم چلائی۔ بنگلا دیش سے فرار ہونے والے تمام عوامی لیگ کے رہنماؤں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنی پارٹی کے لوگوں سے رابطہ کیا اور انہیں اس مظاہرے میں شرکت کی تلقین کی۔ بے تحاشا وسائل کا استعمال کیا گیا اور اس مظاہرے کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور مہم چلائی اور پورے بنگلا دیش میں یہ فضا بنانے میں کامیاب ہوگئے کہ عوامی لیگ دوبارہ منظّم ہورہی ہے۔لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ڈاکٹر یونس کی حکومت تذبذب کا شکار ہوگئی۔

عوامی لیگ کی طرف سے کمپین اتنی بھرپور کی گئی کہ طلبہ رہنماؤں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بہت منظّم ہوکر میدان میں آنا پڑا۔۹ نومبر کی رات کو انہوں نے طلبہ کو ہدایت کی کہ رات کو ہی ڈھاکا کا کنٹرول سنبھال لیں، خاص طور پر اُن جگہوں پر جہاں عوامی لیگ نے مظاہروں کا اعلان کیا تھا۔ طلبہ رہنماؤں نے دوبارہ تمام دینی جماعتوں سے رابطہ کیا۔ اُن میں جماعت اسلامی، نظامِ اسلام پارٹی، جمعیت علمائے

اسلام، پیر چرمنائی اور شبر کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور ۱۰/نومبر کو میدان میں موجود رہنے کی اپیل کی۔ اُن کی اپیل پر بنگلا دیش کی تمام دینی جماعتوں نے سپورٹ کیا اور ۱۰/تاریخ کو صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد ڈھاکا شہر کو گھیر لیا۔ یہ لوگ توقع کر رہے تھے کہ عوامی لیگ مسلح ہوں گے اس لیے یہ لوگ بھی تیاری کر کے آئے تھے۔ انہوں نے ہر گلی ہر سڑک اور ہر چوک پر قبضہ کیا اور عوامی لیگ کا انتظار کرنے لگے۔ یہ لوگ بھی تعداد میں لاکھوں میں تھے اور ملک کی خاطر پُرعزم تھے۔ یہ لوگ سارا دن انتظار کرتے رہے مگر عوامی لیگ نے سڑک پر نکلنے کی ہمت نہ کی۔ علما کرام نے خبردار کیا کہ عوامی لیگ کو پورے بنگلا دیش میں کسی جگہ جلسے اور جلوس کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس سے حکومت کی پوزیشن اور مضبوط ہوگئی۔ جس ذلت اور رسوائی کا عوامی لیگ نے سامنا کیا۔ اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ عوامی لیگ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرے گی۔

حکومت کی طرف سے یونیورسٹی اور کالجز کھلنے کا اعلان کیا گیا تو اکثر کالجوں کے پرنسپلز نے استعفیٰ دے دیا اور اسی طرح یونیورسٹیز کے V.Cs نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ یہ سب بھی حسینہ حکومت نے نامزد کیے ہوئے تھے اور یہ سب لوگ حسینہ گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کرپشن میں مبتلا تھے اور سب مالی بددیانتی میں ملوث تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ طلبہ رہنماؤں کی پکڑ میں نہ آجائیں۔ لہٰذا سب نے ڈیوٹی چھوڑ کر فرار ہونے کو ترجیح دی۔ حکومت نے ان خالی عہدوں کو پر کرنے کے لیے ایک سرچ کمیٹی بنائی۔ کمیٹی نے پورے بنگلا دیش کی یونیورسٹیز کے V.C کی خالی سیٹوں کے لیے نامزدگی کی سفارش کی اور اسی طرح کالجز کے پرنسپلز کی بھی سفارش کی۔ حکومت نے دیکھ بھال کر سب کو نامزد کیا اور یوں تعلیمی سرگرمیاں بحال ہوئیں۔

عدالتی بغاوت کی کوشش!

بنگلا دیش ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے اچانک فل کورٹ کا اجلاس بلا لیا۔ ہائی کورٹ میں ۳۰ جج تھے سب کو فل کورٹ کے لیے بلا لیا گیا۔ طلبہ رہنماؤں کو شک ہوا کہ یہ کوئی سازش ہوسکتی ہے۔ انہوں نے ججز کی نگرانی کی اور اُن کی سرگرمیوں کو مانیٹر کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ فل کورٹ میں حسینہ واجد کی بحالی کا اعلان کر سکتے ہیں۔ نگران حکومت کے قیام کو غیر قانونی کہہ کر بحران پیدا کر سکتے ہیں۔ طلبہ رہنماؤں کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ عدالت کا گھیراؤ کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے عدالت کا گھیراؤ کر کے ہائی کورٹ کے ججز سے استعفوں کا مطالبہ کیا۔ دوسری طرف ہائی کورٹ کے ججوں نے بھی استعفوں سے انکار کر دیا۔

بنگلا دیش کا عدالتی نظام شدید بحران کا شکار ہوگیا۔ اس ڈیڈلاک کو ختم کرنے کے لیے بنگلا دیش کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے تمام ججوں کو اپنے چیمبر میں چائے پر بلا لیا۔ مشاورت کے بعد یہ طے ہوا کہ تمام ججز لمبی چھٹی پر چلے جائیں گے۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ نے طلبہ رہنماؤں کو سمجھایا کہ ان کے اختیار میں نہیں ہے کہ تمام ججز کو فارغ کر دے۔ انہوں نے کہا کہ وہ آئندہ ان ججز کو کوئی بینچ نہیں دیں گے۔ اس طرح اُن ججز کو عدالتی امور سے فارغ کیا گیا۔ حکومت نے ان کی جگہ ۲۳ نئے ججوں کا تقرر کیا اور انہیں عدالتی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔

بارڈر ایشو: بھارت کے ساتھ سرحدی معاملہ!

ڈاکٹر یونس کی حکومت اور طلبہ رہنماؤں کو یہ بات سمجھ آگئی کہ سرحد پر بھارت کا کنٹرول ہونے کی وجہ سے جب چاہیں بھارتی شہری بنگلا دیش میں داخل ہوتے ہیں اور جب چاہیں واپس چلے جاتے ہیں۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں R.A.W کے ایجنٹ بھی شامل تھے جو بنگلا دیش کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کر رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے لیفٹیننٹ جنرل جہانگیر عالم کی قیادت میں بارڈر فورس کو ازسرِنو منظم کیا اور حکم دیا کہ سرحد کو مکمل سیل کر دیا جائے اور بھارتی فوج کی طرف سے کوئی غیر قانونی دراندازی نہ ہو۔ بنگلا دیش اور بھارت کے درمیان ۴ ہزار کلومیٹر سے زیادہ بارڈر ایریا ہے۔ جناب جہانگیر عالم نے بہت محنت سے یہ کام کیا اور بالآخر سرحد کو سیل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب کوئی بھارتی غیر قانونی طور پر بنگلا دیش میں داخل نہیں ہوسکتا۔

بنگلا دیش کے وزیر قانون ڈاکٹر عاصم نزرل نے کہا ہے کہ ۲۸ لاکھ بھارتی ہنرمند بنگلا دیش میں کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ بنگلا دیش کی مختلف صنعتوں میں کام کرتے ہیں۔ اور زیادہ تر لوگ بنگلا دیش کی گارمنٹس انڈسٹری میں کام کرتے ہیں۔ بھارتی حکومت اور R.AW کی ہدایت پر امن وامان کی صورتِ حال کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختلف مطالبات کے ذریعے وہاں جلاؤ اور گھیراؤ کرتے ہیں۔ مقصد اُن کا یہ ہوتا ہے کہ گارمنٹس کی پیداوار متاثر ہو، تاکہ جو آرڈر ملے ہیں وہ مکمل نہ کر سکیں اور اس کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکیں۔ اس طرح بنگلا دیش کی معیشت کو تباہ کر دیں۔

واضح رہے کہ بنگلا دیش میں ۴۵۰۰ گارمنٹس انڈسٹریز دن رات کام کرتی ہیں۔ ۱۴۳۰ سے زیادہ ٹیکسٹائل ملیں ہیں۔ صرف ڈھاکا کے (SAVAR) ساور کے علاقے میں ہی ۴۱۰ گارمنٹ فیکٹریاں ہیں، بھارت کا اصل مقصد بنگلا دیش کی اس انڈسٹری کو تباہ کرنا ہے جہاں لاکھوں بنگلا دیشیوں کو روزگار ملتا ہے اور ان گارمنٹس فیکٹریوں کے ذریعے بنگلا دیش ۴۴ بلین ڈالر سالانہ زرِمبادلہ کماتا ہے۔ گویا یہ بنگلا دیش کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔ بھارت بنگلا دیش کے اس کاروبار کو تباہ کر کے یہ گارمنٹس انڈسٹری اپنے ملک میں لگانا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر یونس کی حکومت نے طالب علم رہنماؤں سے مل کر گارمنٹس انڈسٹری کے مزدور رہنماؤں اور اُن کے مالکان سے مل کر مذاکرات کیے اور معاملات طے کیے اور ۱۵/نکاتی فارمولے پر اتفاق ہوا۔ اس سمجھوتے میں گارمنٹس انڈسٹری کے مالک اور مزدور دونوں کے مفادات کا خیال رکھا گیا اور یوں یہ معاملہ بھی خوش اسلوبی سے حل ہوا، اور دوبارہ صنعتی پیداوار بحال ہوئی۔ اس معاملے میں بھی فوج نے حکومت کا مکمل ساتھ دیا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فوج، حکومت اور طلبہ رہنماؤں نے مل کر یہ کام کیا۔

خدا خدا کر کے گارمنٹس انڈسٹری نے بھرپور طریقے سے پیداوار شروع کی۔ بھارت کو یہ انتہائی ناگوار گزرا اور بھارت نے فوری طور پر بنگلا دیش گارمنٹس ایکسپورٹ کرنے کے لیے اپنا روٹ بند کر دیا۔ حسینہ دور میں ہوتا یہ تھا کہ جہاز کے ذریعے بنگلا دیش کے ریڈی میڈ گارمنٹس ایکسپورٹ کے لیے بنگلا دیش بندرگاہوں سے شپ کے ذریعے کلکتہ لے جایا جاتا تھا اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے دنیا کے مختلف ممالک میں پہنچتا تھا۔ بھارت کو اس سے بھاری زرِمبادلہ بھی حاصل ہوتا تھا۔ اچانک بھارت کی طرف سے اس کو بند کر دینے سے بنگلا دیش گارمنٹس انڈسٹری کو نقصان کا اندیشہ ہوا۔

ڈاکٹر یونس نے فوری طور پر مالدیپ کے صدر سے بات کی اور گارمنٹس انڈسٹری کے لیے مالدیپ کا روٹ مانگ لیا۔ مالدیپ نے بہت خوشی سے یہ پیشکش قبول کر لی اور اس پر مزید یہ کہ مالدیپ نے اسے کم قیمت اور زیادہ سہولتوں کا اعلان کیا۔ واضح رہے کہ بنگلا دیش کا ۲۰۲۴ء میں گارمنٹس ایکسپورٹ ۴۴/ ۴۷ بلین ڈالر تھا، جو بنگلا دیش کی کل آمدنی کا ۸۰ فی صد تھے۔

یہ سب کچھ کرنے کے باوجود یعنی بھارت کے ہر حربے استعمال کرنے کے باوجود وہ ڈاکٹر یونس کو اپنی گرفت میں نہ لا سکا مگر بھارت ابھی بھی مایوس نہ ہوا اور اس نے نیا اقدام یہ

کیا کہ بنگالی شہریوں کو بھارت کا ویزا دینا بند کر دیا۔ بنگلا دیشی سیاحوں اور علاج معالجے کے لیے جانے والوں کا ویزا بند کر دیا گیا۔ اس سے بھارت کے زرِمبادلہ میں اضافہ ہوتا تھا۔ بنگلا دیش سے پابندی کے بعد ان لوگوں کا کسی اور ملک میں جانا بھی بند ہو گیا، کیونکہ حسینہ واجد نے یہی قانون بنایا تھا کہ جو بھی باہر کہیں جانا چاہے گا وہ پہلے بھارت جائے گا پھر وہاں سے ویزا لگوائے گا۔ اب ویزا بند ہونے کی وجہ سے بیشتر ممالک میں مقیم بنگلا دیشی لوگوں کے ویزا مدت ختم ہوئی تو نوکریاں ختم ہو گئیں۔ صرف ملائیشیا میں ہی ۱۸ ہزار لوگوں کی نوکری ختم ہو گئی۔ حال ہی میں جب ملائیشیا کے وزیراعظم بنگلا دیش کے دورے پر تشریف لائے تو ڈاکٹر یونس نے اُن کے پاس اس مسئلے کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم سب لوگوں کا ویزا دوبارہ بحال کریں گے تاکہ وہ ملائیشیا آ کر دوبارہ اپنی جاب جوائن کر لیں۔

دوسری طرف ڈاکٹر یونس نے اہم اقدام یہ کیا کہ آسٹریلیا، یورپ، امریکا، جرمنی، برطانیہ، ملائیشیا، سعودی عرب اور دیگر ممالک کے سفیروں کو اپنے دفتر میں بلایا اور ویزوں کے مسئلے پر بات کی۔ سب نے انہیں یقین دلایا کہ وہ فوری طور پر بنگلا دیش میں ہی ویزا لگانے کا انتظام کریں گے۔ بنگلا دیش کے عوام ڈاکٹر یونس کے اس اقدام پر بہت خوش تھے۔

بجلی کا مسئلہ!

شیخ حسینہ کے دورِ حکومت میں بنگلا دیش میں بجلی کی پیداوار پر توجہ دینے کی بجائے بھارت سے مہنگے داموں بجلی خریدی جاتی تھی۔ اس سے بنگلا دیش کی اکانومی کے اربوں ڈالر خرچ ہو جاتے تھے۔ جتنے ڈالرز وہ بھارت کو بجلی خریدنے پر ادا کرتے تھے اس سے کم خرچ پر بنگلا دیش میں بجلی کی پیداوار کی جا سکتی تھی، لیکن سابقہ حکومت نے اس پر بالکل توجہ نہیں دی۔ حسینہ واجد کے دور کے ختم ہوتے ہی ڈاکٹر یونس کی حکومت کے آتے ہی بھارت نے بجلی کی سپلائی بند کر دی۔ یہ سپلائی اس لیے بند کی کہ بنگلا دیش نے ادائیگی نہیں کی تھی اور یہ سابقہ دورِ حکومت کے وقت کی بات ہے۔ جیسے ہی ڈاکٹر یونس حکومت میں آئے تو انہوں نے تقریباً ایک بلین ڈالرز کی ادائیگی کر دی تھی۔

لیکن مزید ۷۰۰ ملین ادا ہونا باقی تھے۔ ڈاکٹر یونس کی حکومت نے اڈانی گروپ سے بقیہ رقم ادا کرنے کا یقین دلایا تھا، لیکن بھارت کے اڈانی گروپ نے اچانک بجلی کی سپلائی بند کر دی۔ اُن کا مقصد بنگلا دیش انڈسٹری میں پیداوار کو خاص طور پر گارمنٹس فیکٹریوں کی پیداوار کو نقصان پہنچانا تھا۔ بنگلا دیش کی حکومت ساتھ ساتھ عوام کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ عوام یہ بات سمجھ رہے تھے کہ بھارت بنگلا دیش کو زِچ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عوام نے حکومتی اقدامات کا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر یونس نے بھوٹان سے بجلی کا معاہدہ کیا اور بجلی کی ترسیل کو بہتر کیا اور ملک میں نئے پاور پلانٹ لگانے کے اقدامات شروع کر دیے۔ بھارت کی طرف سے مسلسل اس طرح کے اقدامات نے عوام کے دل میں اور نفرت بھر دی۔

بھارت کی طرف سے ویزے بند کرنے کی وجہ سے خود بھارت کو ہی معاشی طور پر بہت نقصان ہوا۔ بنگلا دیش بننے کے بعد بنگلا دیشی عوام سیاحت کے لیے اور علاج معالجے کے لیے بھارت جاتے تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بھارت کو اس کے لیے ۱۰۰ نئے ہوٹل بنانے پڑے تھے۔ بہت سارے گیسٹ ہاؤسز بنائے گئے تھے۔ نئی مارکیٹس کھولی گئی تھیں۔ بہت سارے اسپتال کھل گئے تھے۔ اب بنگلا دیشی عوام کی طرف سے بائیکاٹ اور کچھ ویزوں پر پابندی کی وجہ سے سب ویران پڑا ہے۔ کلکتہ کے بازار سنسان ہو گئے۔ جن کے کاروبار ٹھپ ہو گئے، وہ سب حکومت بھارت سے مطالبات کر رہے ہیں کہ بنگلا دیش سے تعلقات بہتر کیے جائیں اور انہیں ویزے جاری کیے جائیں اور انہیں وہ تمام سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ بنگلا دیشی عوام دوبارہ بھارت آنا شروع کرے اور ان کے کاروبار بحال ہوں۔ بنگلا دیش کے عوام بھارت سے شدید نفرت کرنے لگے ہیں، اس وقت وہاں ہر طرف بھارت کے خلاف نعرہ لگ رہا ہے کہ اب بھارت کی غلامی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ وہ بھارت سے تعلقات کو زیرو پر لانا چاہتے ہیں۔ Dependancy (بھارت پر انحصار) کو زیرو پر لانا چاہتے ہیں۔

جب ۵/اگست (حسینہ واجد کے فرار) کا واقعہ ہوا تھا تو بھارت کو یہ امید تھی کہ بنگلا دیش کو بھارت کے سامنے بالآخر جھکنا پڑے گا۔ بنگلا دیش کو چلانے کے لیے ہتھیار ڈالنے ہوں گے، لیکن طلبہ رہنماؤں کی کوششوں اور ڈاکٹر یونس کی بہترین حکمت عملی کی وجہ سے ہر طرف سے مدد کرنے والے آ گئے۔ بھارت کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بنگلا دیش بھارت کی مدد کے بغیر اپنی حکومت چلا پائے گا۔

بھارت اس وقت شدید اضطراب اور غصے میں ہے۔ بنگلا دیش کو سبق سکھانے کے لیے تیار ہے۔ اُن کی فوج بھارتی سرحد پر کھڑی ہے۔ کسی بھی وقت وہ مداخلت کر سکتے ہیں، لیکن وہ ڈاکٹر یونس کی حکمت عملی سے ڈرتے ہیں۔ پوری دنیا ڈاکٹر یونس کی ایک فون کال کی منتظر ہے۔ بنگلا دیش میں بھارت اور RAW کی تمام چالیں اور سازشیں ڈاکٹر یونس کی حکمت عملی کے سامنے شکست سے دوچار ہیں۔ کوئی بڑا اقدام کرنے کا بھارت بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ ۵۳ سال کے بعد پاکستان کا ایک سمندی جہاز کراچی بندرگاہ سے سامان لے کر چٹاگانگ بندرگاہ پہنچا تو بھارت میں کھلبلی مچ گئی کہ جہاز براہِ راست پاکستان سے کیسے بنگلا دیش پہنچ گیا۔ یہ اُن سے تعلقات کا نیا دور کیسے شروع ہو گیا جس کی خبر بھی بھارت کو نہ ہو سکی۔

۲۰۱۵ء میں حکومت بنگلا دیش کی ہدایت پر ڈھاکا یونیورسٹی نے پاکستان سے ہر قسم کا رابطہ ختم کر دیا تھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی اور اس سے ملحقہ تعلیمی اداروں میں کسی پاکستانی کو داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ اب ڈاکٹر یونس کی حکومت نے اس پابندی کو اٹھانے کے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ بھارت اس پر سراپا احتجاج ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہم صرف دیکھتے رہ جائیں اور کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ پابندی اٹھتے ہی ڈھاکا یونیورسٹی میں ۹ نومبر کو علامہ اقبال ڈے منایا گیا۔ بلاشبہ یہ پاکستان اور بنگلا دیش کے تعلقات درست کرنے میں ایک بہترین آغاز ہے۔

بنگلا دیش اور بھارت کے تعلقات!

حیرانی کی بات یہ ہے کہ بھارت کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ بنگلا دیش کے عوام مجیب الرحمان اور حسینہ واجد سے جڑی ہر چیز سے نفرت اور لاتعلقی کا اظہار کر رہے ہیں، اور اُن کی باقیات کو توڑ پھوڑ رہے ہیں، اور بھارت کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہے۔ جھارکھنڈ (Jahr Khand) میں بھارتی وزیر داخلہ امیت شاہ نے اعلان کیا ہے کہ بنگالیوں کو پھندوں پر جھلا کر سیدھا کرنے کی ضرورت ہے اور ہم اُن کو سیدھا کریں گے۔ امیت شاہ نے یہ بات ۲۰ ستمبر کو کی ہے۔ بنگلا دیش کی حکومت نے اس کی شدید مذمت کی ہے۔ ۱۵/ستمبر کو جمشید پور شہر میں بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے کہا کہ بنگلا دیش کے متعلق بھرپور اقدامات کیے جائیں گے۔ ۵ ستمبر کو بھارتی وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ نے فوجی کمانڈر کو یہ حکم دیا کہ وہ جنگ کے لیے تیار رہے۔ وہ بنگلا دیش کے مسئلے پر فوجی کمانڈروں سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کمانڈرز کو ہدایت کی کہ وہ سرپرائز (اچانک) اٹیک کے لیے تیار رہیں۔

تہذیبوں کی تشکیل و تعمیر اور
اسلامی تہذیب کی بنیادی خصوصیات

سید عنایت اللہ جان

تہذیب کسی بھی ملت کے مجموعی طرزِ زندگی کو کہا جاتا ہے یعنی ایک قوم کے ذہنی، علمی، سماجی، اخلاقی، مادی اور روحانی معیار اور اثاثہ کیا ہے؟ انسان نے اپنی طویل تاریخ میں بے شمار تہذیبوں کو وجود بخشا ہے اور پھر اپنے ہی ذہن اور ہاتھوں ان کا خاتمہ بھی کر بیٹھا ہے۔ تہذیبوں کا ارتقائی و اختتامی عمل دراصل اس حقیقت کی دلیل ہے کہ انسان اپنے فکر و عمل میں یکسر آزاد اور متحرک واقع ہوا ہے جبکہ اہلیت اور نااہلی کی حالتیں بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔ آزادی اور حرکت کے اس عمل میں وہ لاتعداد تبدیلیوں، بہتریوں اور تباہیوں کے تجربات سے گزرتا ہے، آگے بڑھتا ہے اور ایک نئے تہذیبی سفر پر نکلتا ہے۔ اس دائرے کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو انسان کہیں کہیں آزاد ہے اور کہیں کہیں برابر طور پر پابند بھی۔ انسان کا تہذیبی وجود آزادی کا بھی متقاضی ہے اور عین برابر میں کسی حد تک پابندی کا بھی کیونکہ بعض انسانی مصالح آزادی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں تو عین اسی طرح کچھ بنیادی چیزیں پابندی کے ساتھ بھی۔

تہذیبوں کی بنیادوں میں یوں تو بہت سارے فرق پائے جاتے ہیں لیکن اصولی فرق ایک ہی ہوتا ہے، اور وہ ہے ایک تہذیب کا حامل خدا ہونا یا پھر مخالف طور پر بے خدا ہونا۔ خدا پرستانہ تہذیب میں اخروی نجات کی خاطر جواب دہی کا احساس پایا جاتا ہے جبکہ بے خدا تہذیب میں دنیاوی راحت کے حصول کے لیے آزادی کا تصور۔ اسی نکتے سے تہذیبوں کے راستے الگ ہو جاتے ہیں اور یوں انسانوں کے طرزِ عمل بھی۔ تہذیبوں کے نمو و ارتقا میں مذہب اور الحاد کا بنیادی ہاتھ ہوتا ہے۔ تہذیبوں کے میدان میں اصل مقابلہ مذہب اور الحاد کے درمیان برپا ہے یعنی اس پوری بساط کا ایک خالق ہے یا اس سب کچھ کے پیچھے محض ایک اتفاقی حادثہ کارفرما؟ پھر ایک اور مقابلہ جزوی طور پر مذاہب کے مابین بھی لگا رہتا ہے کہ کچھ مذاہب شرک کی طرف چلے جاتے ہیں اور کچھ توحید پر قائم رہتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں توحید کا نمائندہ مذہب اسلام ہے اور ہم اسلام کے نقطۂ نظر سے ہی اس کی تہذیب کا ایک طائرانہ سا نظارہ کریں گے۔

ہر تہذیب کو اظہار کے لیے دو راہیں درکار ہوتی ہیں ایک علم کی راہ اور دوسری کردار کی راہ، یعنی ایک قوم سوچتی کیا ہے اور عملاً کرتی کیا ہے؟ سوچ کا حاصل حصول علم ہے اور عمل کا حاصل حصول کردار۔ انسان نے مختلف علوم و فنون اور کردار و اخلاق سے طرح طرح کی تہذیبوں کے وجود وارتقا میں کام لیا ہے جبکہ مختلف تہذیبی دھاروں کی مدد سے، اس نے نوع بہ نوع علوم و کردار کو نمایاں کرنے میں۔

اسلامی تہذیب، جو تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پر محیط ہے اور اسپین سے لے کر جنوب مشرقی ایشیا تک ایک وسیع و عریض جغرافیائی علاقے پر پھیلی ہے (اسپین کی حد تک، تاریخی تناظر میں، کیونکہ ابھی تو کچھ ہی ثقافتی نقوش کے علاوہ، کچھ بھی باقی نہیں ہے) انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ بااثر اور متحرک تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں مختلف ممتاز خصوصیات نے اس کے متنوع ثقافتی، فکری، اخلاقی، مادی اور فنی ورثے کو محفوظ بنایا ہیں۔ عملی طور پر ہر تہذیب کی طرح اسلامی تہذیب بھی چار پانچ چیزوں پر فوکس کر رہی ہے یعنی کلام، طعام، لباس، طرزِ رہائش اور طرزِ اظہار مثلاً غم و خوشی منانے کے مختلف انداز۔ کلام میں اسلام کا اصل زور سچائی و نرمی پر، طعام میں حلال و طیب پر، لباس میں ساتر و باوقار ہونے پر اور طرزِ رہائش میں سادگی و پر سہولت ہونے پر دیتا ہے۔ اس طرح اخلاق میں اسلام کا بنیادی زور شفقت و احترام پر، سماج میں برابری و احساس پر، تعلقات میں خلوص اور محبت پر جبکہ اجتماعی نظام میں انصاف اور استحقاق پر رہتا ہے۔ تہذیبی رویوں میں خواتین کا لحاظ، بزرگوں کا احترام، بچوں پر شفقت اور جوانوں پر اعتماد لازم ہے۔ اسلامی تہذیب میں رشتوں کا تعین موجود ہے، ان کے حقوق مقرر ہیں، ان سے حسنِ سلوک مطلوب ہے اور ان کے مفاد اور توقعات دیکھنا عنداللہ ضروری ہے۔ اسلامی تہذیب جس مزاج، اخلاق، رویوں اور جذبات کو فروغ دیتی ہے، اُس کا خاص نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرد آزاد بننے کے بجائے ذمہ دار بنے، وہ لاتعلق بننے کے بجائے حصہ دار رہے، اپنے ذاتی یا گروہی مفادات کے چکر میں پڑنے کے بجائے اجتماعی مفادات کو عزیز رکھے، فرائض اور حقوق میں کسی ایک جانب جھکنے کی بجائے متوازن رہے، وسائل کی پیداوار اور اخراجات کی ترتیب میں بخیلی سے کام لے اور نہ ہی عیاشی سے بلکہ ہر موقع اور وقت پر اعتدال کا مظاہرہ کرے۔

ہر تہذیب کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور کچھ مظاہر بھی، اوپر بیان شدہ رویے اصولی ہیں جبکہ اب کچھ تذکرہ مظاہر کا بھی ہو جائے۔ اسلامی تہذیب کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک اس کا طرزِ تعمیر ہے۔ اسلامی فنِ تعمیر کی خصوصیت اس کے متنوع ہندسی نمونے اور عربی خطاطی ہے، جو مساجد، محلات اور عوامی عمارتوں کی زینت بن رہی ہے۔ اسلامی فنِ تعمیر میں گنبدوں، میناروں، باغوں، حوضوں اور صحنوں کا استعمال ایک گہری علامتی اہمیت رکھتا ہے، جو آسمانی اور زمینی دائروں کو جوڑنے کی نمائندگی کرتا ہے۔ مساجد کا ڈیزائن، خاص طور پر، قبلہ، مکہ کی سمت، اور نماز ہال کے اردگرد مرکوز ہے، جہاں مسلمان پانچ وقت عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کی فنی روایات ہیں، جو خطاطی کی روشنی میں جدت اور روایت کے وسیع دائرے کا احاطہ کر رہی ہیں۔ اسلامی فنِ خطاطی ہندسی ڈیزائنوں اور پھولوں کی شکلوں کے استعمال کے لیے جانا جاتا ہے، جو اسلامی تصور میں کائنات کے اتحاد اور ہم آہنگی کی عکاسی کر رہے ہیں۔ خطاطی، خاص طور پر، اسلامی فن میں ایک خاص مقام رکھتی ہے، کیونکہ تحریریں اسلام میں انتہائی قابل احترام سمجھی جاتی ہیں اور اکثر و بیشتر مساجد، دوسرے مقامات اور مختلف اشیا کو سجانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

اسلامی تہذیب اپنی سائنسی کامیابیوں کے لیے بھی خاص شہرت رکھتی ہے، جس نے انسانی علم کی ترقی پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا ہے۔ اسلام کے سنہری دور میں یعنی ۸ویں صدی عیسوی سے ۱۴ویں صدی عیسوی تک، مسلمان علماء نے فلکیات، ریاضی، طب اور فلسفہ جیسے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔ اس طرح اسلامی تہذیب اپنے ثقافتی تنوع اور جامعیت کے لیے بھی مشہور ہے۔ اسلام کے کلیدی اصولوں میں سے ایک ''تنوع میں اتحاد'' کا نظریہ بھی ہے، جس کی عکاسی اسلامی شہروں اور معاشروں کے ڈیزائن میں ہوتی ہے، جہاں مساجد، بازار اور دوسرے عوامی مقامات مختلف پس منظر اور عقائد رکھنے والے لوگوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ امت کا تصور، نسلی، لونی اور لسانی حدود سے بالاتر ہو کر دنیا بھر کے مسلمانوں میں یکجہتی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح اسلامی تہذیب کا سب سے پائیدار اثاثہ اس کا ادبی ورثہ ہے جس میں شاعری، فلسفہ اور تاریخ نویسی کے مختلف کام شامل ہیں۔

اسلامی مخطوطات کا ڈیزائن، ان کی خوبصورت خطاطی اور روشن دائروں کے ساتھ، مسلمان کاتبوں اور فنکاروں کی جمالیاتی ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔ رومی، حافظ اور ابن عربی جیسے مسلم شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات ان کی گہری روحانی بصیرت اور اعلیٰ شاعرانہ ذوق کے سبب حد درجہ قابل احترام ہیں، جب کہ مسلم فلسفیوں جیسے ابنِ سینا، ابنِ خلدون اور الفارابی نے مابعد الطبیعات، اخلاقیات اور الٰہیات کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں سائنسی ترقی کا آغاز اسلام کے سنہری دور سے لگایا جاسکتا ہے جو کہ ۸ ویں صدی عیسوی سے ۱۴ ویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا تھا۔ اس دوران مسلمان علما نے ریاضی، فلکیات، طب اور کیمسٹری سمیت سائنس کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مسلمانوں کی سائنسی خدمات میں ایک قابل ذکر پہلو ریاضی کا میدان ہے۔ مسلمان ریاضی دانوں نے الجبرا، جیومیٹری اور مثلثیات میں اہم کردار ادا کیا۔ اس زمانے کے سب سے مشہور ریاضی دانوں میں سے ایک محمد بن موسیٰ الخوارزمی شامل تھے، جنہیں عموماً الجبرا کا باپ کہا جاتا ہے۔ الجبرا پر الخوارزمی کے کام نے جدید الجبری اشارے اور طریقوں کی بنیاد رکھی ہے۔ اس طرح اسلامی فلکیات نے بھی ترقی کی ہے، مسلمان علماء نے ستاروں، سیاروں اور دیگر آسمانی اجسام کے مطالعے میں بھی قابلِ ذکر پیش رفت کی ہے۔ مشہور مسلمان فلکیات دانوں میں سے ایک ابوالریحان البیرونی تھے جنھوں نے فلکیات اور ریاضی کے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ زمین کے طواف اور مختلف آسمانی اجسام کے سائز کے تعین پر البیرونی کا کام اس وقت بہت اہم تھا۔ اس طرح طب کے میدان میں، اسلامی اسکالرز نے اناٹومی، فزیالوجی (علم الاعضا)، اور فارماکولوجی (ادویہ سازی) کے مطالعے میں اہم پیش رفت کی ہیں۔ سب سے زیادہ بااثر مسلمان ڈاکٹروں میں سے ایک ابن سینا تھا۔ ابن سینا کی مشہور طبی درسی کتاب ''کینن آف میڈیسن'' صدیوں سے یورپ میں ایک معیاری طبی ماخذ کے طور پر پڑھی جاتی تھی اور اس نے طب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس طرح اسلامی اسکالرز نے کیمسٹری کے شعبے میں بھی اہم کامیابیاں اپنے نام کیے ہیں، مسلم کیمیا دانوں نے کشید کاری، سربلندی اور کرسٹلائزیشن (وضاحت وتعین) کے لیے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ مشہور مسلم کیمیا دانوں میں سے ایک جابر بن حیان تھے، جنہیں اکثر کیمسٹری کا باپ کہا جاتا ہیں۔ جابر بن حیان کے کام نے جدید کیمیا کی بنیاد ڈالی ہے اور اس نے آگے چل کر کیمیا اور دھات کاری کے شعبوں میں اہم دریافتیں کیے ہیں۔

آٹھویں صدی سے چودھویں صدی تک مجموعی طور پر اسلام کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے اور اس دور میں قابل ذکر سائنسی اور تہذیبی ترقی ہوئی ہے۔ مسلمان سائنسدانوں نے مختلف سائنسی شعبوں میں اہم شراکتیں انجام دیں ہیں اور ان کے کام نے بہت سی مزید سائنسی ترقیوں کی بنیاد رکھی ہے جس کو آج بھی دنیا تسلیم کررہی ہے۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ گزشتہ چار پانچ صدیاں اسلامی تاریخ کی ایسی گزری ہیں جن میں کوئی خاص سائنسی کام، کامیابی یا حصہ داری ہمیں نظر نہیں آرہی۔ سائنسی علوم میں ترقی کے عمل کو بریک کیوں لگی؟ اس کے اسباب اور وجوہات پر امت کی سرکردہ شخصیات اور اداروں کو خوب سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے تاکہ نہ صرف ہم اپنی آبادی کے برابر علوم کے ارتقائی عمل میں درست حصہ دار بنیں بلکہ اقوام عالم میں ایک باوقار مقام بھی پانے میں کامیاب ہوں۔ کیونکہ فی زمانہ فوقیت کے لیے علوم کے میدان میں نمایاں کردار شرط اول ہے۔

(بحوالہ: ''بادبان ڈاٹ کام''۔ ۱۳؍جنوری ۲۰۲۵ء)

گھنٹے بچانے سے بہتر ہے، سیکنڈ بچائیں

Nick Sonnenberg

تقریباً گزشتہ آٹھ سال تک میں نے اپنا ہر دن کمپیوٹر اسکرین کے پیچھے بیٹھ کر گزارا ہے۔ میں بہت بڑا ٹریڈر تھا اور میرا کام ایسے الگورتھم تیار کرنا تھا جو مائکروسیکنڈز کی رفتار سے اربوں ڈالر کی ٹریڈنگ کرسکیں۔ یہ ریاضیاتی قیمتوں کے درمیان ایک ایک کوڑی کے فرق کو پکڑنے کی کوشش تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ، یہ الگورتھم اس بینک کے لیے کئی ملین ڈالر کا منافع تخلیق کرسکتے تھے کہ جس کے ساتھ میں کام کررہا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا، اس کی بنیاد ریاضی اور ڈیٹا پر تھی۔ میں ان کمپنیوں کے بارے میں کہ جن کے ساتھ ٹریڈنگ کررہا تھا، ان کی اسٹاک ٹیکر (stock ticker) سے ہٹ کر کچھ نہیں جانتا تھا اور اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ یہ سارا کھیل نمبروں کا تھا۔

انتہائی تیز رفتار ٹریڈنگ کی دنیا میں، ایک مائکروسیکنڈ کا حاصل ہونا یا کھونا، کئی ملین ڈالر کے منافع ہونے یا کھونے کے مترادف ہوسکتا ہے۔

مجھے یاد ہے، میں ٹیلی کام کمپنیوں کے ساتھ کانفرنس کالز پر تھا اور ان کے نئے ٹاور کی اونچائی پر تبادلۂ خیال کررہا تھا اور حساب لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ کیا یہ واقعی شکاگو اور نیویارک کے درمیان سب سے اچھے راستے میں مائکروویو سگنل بھیج سکتا ہے۔ یہ مائکروسیکنڈ بہت اہم تھے۔

اس کام سے مجھے کئی قابل قدر سبق سیکھنے کو ملے، لیکن ان میں سے ایک نکتے نے واقعی میری زندگی بدل دی اور میں نے سیکنڈ کی حقیقی قدر جانی۔

دیکھیں، بہت سے لوگ یہ محسوس کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ ان کے پاس اپنا وقت بچانے کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے مواقع ہوتے ہیں اور جیسے، پیسے کے مہین اجزا کی طرح جو میرے الگورتھم نے تخلیق کیا، یہ چھوٹی چھوٹی وقت کی بچتیں اگر جاری رہیں (اور کئی افراد کے گروپوں پر محیط ہوں) تو خاصی نمایاں ہوسکتی ہیں۔

آج میں وال اسٹریٹ جرنل کا بیسٹ سیلر مصنف ہوں (Come Up for Air: How Teams Can Leverage Systems and Tools to Stop Drowning in Work) اور Leverage کا سی ای او ہوں جو آپریشنل کارکردگی کی ٹریننگ کمپنی ہے۔ میری ٹیم اور میں نے ہزاروں اداروں کی کارکردگی کو بڑھاتے ہوئے اور اسٹریس اور بوجھ کو کم کرتے ہوئے انھیں فورچیون دس کمپنیوں میں شامل ہونے میں مدد کی ہے۔

میں نے یہ جانا کہ ہم جن کلائنٹس کے ساتھ کام کرتے ہیں، ان میں سے اکثر ہمارے پاس بڑی کامیابیوں کے لیے آتے ہیں۔ وہ کسی عمل پر کئی کئی گھنٹے بچانا چاہتے ہیں یا پھر کوئی نیا ٹول لاگو کرکے ہر ہفتے چندروز بچانا چاہتے ہیں۔ وہ کھیل اور کام کو بدل دینے والی کسی انقلابی شے کی تلاش میں ہیں۔

ہم سسٹم کو آپٹیمائز کرکے (مثلاً ای میل، سلیک، مائکروسافٹ ٹیمز، پراجیکٹ مینجمنٹ سافٹ ویئر وغیرہ) ہر ہفتے تیزی سے کئی گھنٹے بچانے کے قابل ہیں۔ اور، یہ حقیقت ہے کہ ہمارے پاس وقت کی بچت کے کئی انقلابی طریقے ہیں۔ یہ مواقع یقیناً موجود ہیں اور انھیں ترجیح دی جانی

چاہیے۔ لیکن اکثر اداروں میں (اور اکثر ہماری روزمرزہ زندگی میں) ان حالات کی ایک محدود تعداد ہوتی ہے۔

زیادہ تر افراد اس چیز کو جانچنے میں ناکام رہتے ہیں کہ ابتدائی وقت کی بچت کے بعد کیا ہوتا ہے۔ طویل مدت بعد کیا ہوتا ہے؟ آپ کیسے اس بہتری کو برقرار اور سال بہ سال وقت کی بچت کو جاری رکھ سکتے ہیں؟

میں نے یہ جانا کہ وقت کی چھوٹی چھوٹی بچتوں کے تقریباً لامحدود مواقع ہمارے پاس ہوتے ہیں، لیکن اکثر لوگ انھیں نظرانداز کردیتے ہیں یا پھر انھیں دیکھتے ہی نہیں۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ ان بظاہر چھوٹے مواقع کی اہمیت کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے اور انھیں آنکھیں کھول کر دیکھا جائے کیونکہ یہ مواقع ہر جگہ موجود ہیں۔

ہماری زندگی میں اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ایسے مواقع ضرور موجود ہیں اور نہ صرف یہ ہمارے لیے دستیاب ہیں بلکہ ان کا نفاذ بہت ہی آسان بھی ہے۔ پھر بھی ہم میں سے بہت سے ان سے گزر جاتے ہیں کیونکہ ہم ایک سیکنڈ کی قوت کے بارے میں نہیں سوچتے۔

یہاں ایک مثال دی جارہی ہے جو اکثر قارئین کے لیے قابلِ عمل ہوگی۔ ایک کام جو میری کمپنی ملازمین کو سکھاتی ہے، وہ ای میل کو زیادہ بہتر طور پر استعمال کرنا ہے۔ ہم کئی قسم کی بہترین مشقیں سکھاتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک بہت ہی سادہ ٹوٹکا کیبورڈ شارٹ کٹ کا استعمال ہے۔ یہ بظاہر کچھ خاص نہیں دِکھتا، لیکن ہم نے دیکھا کہ اپنے کمپیوٹر ماؤس کے ذریعے archive button پر کلک کرنے کے مقابلے میں E کی کلید دبانے سے ہم فی ای میل دو سیکنڈ بچا سکتے ہیں۔

ہارورڈ بزنس ریویو کے مطابق، ایک اوسط آفس ورکر کو ایک دن میں ۱۲۰ ای میل وصول ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ اس کیبورڈ شارٹ کٹ کا استعمال کرتے ہیں تو ایک دن میں اپنے چار منٹ بچا سکتے ہیں۔ اس طرح، یہ ہفتے بھر کے ۲۰ منٹ، یا ایک سال کے ۱۶ گھنٹے اور چالیس منٹ ہوگئے۔

چنانچہ محض اپنے کیبورڈ کا ایک بٹن استعمال کرکے آپ ایک سال میں اپنے کام کے پورے دو ایام بچا سکتے ہیں۔ اور، اس میں آپ کے کام سے ہٹ کر آپ جو ای میل استعمال کرتے ہیں، وہ شامل نہیں۔ جب آپ کو یہ پتا چلتا ہے کہ یہ تو بہت سے کیبورڈ شارٹ کٹس میں سے صرف ایک شارٹ کٹ کے ساتھ ایسا معاملہ ہے اور کیبورڈ شارٹ کٹ تو سیکنڈ بچانے کی صرف ایک حکمت عملی ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں اس پر اتنا زور کیوں دیتا ہوں۔

اب، اگر آپ دواؤں کی ڈبیا (pill box) استعمال کرکے ہر روز بیس سیکنڈ بچا سکتے ہیں تو یہ ہر سال کے دو گھنٹے ہوجائیں گے۔ اتنی بات حیران کن نہیں، بلکہ جب آپ دیگر اسی قسم کے طریقے ایک ساتھ استعمال کرنا شروع کردیتے ہیں تو آپ کو اس کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ یہ وہ کلیدی مائنڈ سیٹ ہے جو تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ ایک چھوٹی تبدیلی غیر نمایاں ہوتی ہے، مگر کئی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ایک بڑی تبدیلی لاسکتی ہیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہم ایک سال میں دو ہزار گھنٹے اوسطاً کام کرتے ہیں، اور ایک سال میں دو گھنٹے بچانے کا مطلب ہے، آپ اپنے کام میں ایک فیصد زیادہ پروڈکٹو ہوگئے ہیں۔

اس قسم کی سوچ یقیناً کام کی جگہ پر اہمیت رکھتی ہے جہاں کئی افراد کی پوری ٹیم پر مرکب (کمپاؤنڈ) اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر آپ ای میل شارٹ کٹ کی گزشتہ مثال کو دس افراد کی ٹیم پر نافذ کردیں تو ایک سال میں اس ٹیم کے مجموعی طور پر ۱۶۷ گھنٹے بچیں گے۔ اگر آپ اوسط ۵۰ ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے بھی لگائیں تو محض کیبورڈ شارٹ کٹ کا استعمال کرکے آپ ۸۰۰۰ ڈالر کی بچت کرسکتے ہیں۔

عملی طور پر، ہر قسم کی جاب میں کسی نہ کسی قسم کی تکرار ہوتی ہے۔ آپ اپنے کام کی جگہ پر جو کام بھی ہر دن یا ہر ہفتے کئی بار کرتے ہیں، اسے آپٹیمائز کیا جاسکتا ہے۔ اور، جب آپ سیکنڈ کے تناظر میں سوچتے ہیں تو ایسا کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک سافٹ ویئر جیسے Zapier آپ کو مختلف سافٹ ویئرز کے درمیان کسٹم آٹومیشن کرنے کے قابل بناتا ہے۔ یہ وہ سادہ کام کرسکتا ہے جو آپ کو بصورتِ دیگر مینوئل کرنے پڑتے ہیں۔ یہ آپ کے کئی سیکنڈز (بعض اوقات گھنٹے) بچانے کا ایک حیرت انگیز مفید آلہ ہے۔

چلیں، فرض کیجیے، آپ ہر نئی کمپنی کا بلاگ پوسٹ اپنی ٹیم کو Slack میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ چند منٹ کے اندر اندر، آپ ایسی آٹومیشن تیار کرسکتے ہیں جس کے ذریعے ہر بار جب بلاگ پوسٹ شائع ہوگا، زیپیئر اسے Slack channel کے لنک کو بھیج دے گا۔ اس طرح، یہ کام مینوئل کرنے پر تیس سیکنڈ لگانے کی بجائے یہ کام خود بخود ہوگیا۔

اس اقدام کا محض دفتری کام کرنے والوں (Knowledge workers) پر ہی اطلاق نہیں ہوتا۔ ایک دن میں نے اپنے ملازم کو سموتھی کا آرڈر دیا اور دیکھا کہ اسے کیلے کے چھلکے کچرادان میں پھینکنے کے لیے بلینڈر سے تین فٹ دور جانا پڑا۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر وہ یہ کچرادان بلینڈر کے پاس ہی رکھ لے تو وہ ہر بار سموتھی بناتے ہوئے چند سیکنڈ کی بچت کرسکتا ہے۔

جب آپ وقت کی ان چھوٹی چھوٹی بچتوں کو دیکھنا شروع کردیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ بچتیں آپ کے اردگرد بھری ہوئی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر ان کاموں کو اسی طرح کرنے میں مشغول رہتے ہیں جیسے ہم ہمیشہ سے کرتے چلے آئے ہیں، اور یوں ہم ان بچتوں کو دیکھ نہیں پاتے۔ ہزاروں ٹیموں کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں یہ آپ کو بانگ دہل بتا سکتا ہوں کہ کوئی بھی اپنے کام کے پرانے انداز کو جیسا وہ کرتا چلا آرہا ہے، بدلنا نہیں چاہتا۔ ایسا کرنا مشکل، اضطراب انگیز اور پریشان کن ہوتا ہے، خاص کر ابتدا میں۔ لیکن، ایک بار جب آپ اس پہلی رکاوٹ پر قابو پالیتے اور یہ تسلیم کرنا شروع کردیتے ہیں کہ کام کرنے کے اس سے بہتر طریقے بھی ہیں تو آپ کے سامنے مواقع کی دنیا کھلتی چلی جاتی ہے۔

اگرچہ آپ کی روزمرہ زندگی میں بہت سی چھوٹی کامیابیاں اہم ہوسکتی ہیں، لیکن یہاں کھیل میں کچھ زیادہ بڑا بھی ہے۔ تصور کیجیے کہ اگر ادارے میں ہر فرد یہ سوچ اختیار کرلے۔ تصور کیجیے، اگر آپ کی تمام فیملی ایسا کرنے لگے۔ جب جتھے کے جتھے اس قسم کی سوچ پر عمل شروع کردیں، تو یہ واقعی انقلاب ہوسکتا ہے۔

اور، اس کا آغاز ایک سیکنڈ کی حقیقی قدر کو جاننے سے ہوتا ہے۔

(ترجمہ: سید عرفان احمد)

"Saving seconds is better than hours".
("Time". April 30, 2024)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ

زندگی کے عام فقہی مسائل

(پانچ جلدیں)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قیمت: ۲۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950